گردشِ خاک

منان لطیف

گردشِ خاک

منان لطیف

حسنِ ادب، فیصل آباد

تمام حقوق بحقِ شاعر محفوظ ہیں

کتاب: گردشِ خاک

شاعر: منان لطیفؔ

طبع اول: جنوری ۲۰۲۱ء

کمپوزنگ: منان لطیفؔ

پروف ریڈنگ و نظر ثانی: سیف الرحمٰن خاں بلوچ

تزئین: ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ

اہتمام: حسنِ ادب فیصل آباد

قیمت: ۴۰۰ روپے

ملنے کا پتا: چک نمبر ۳۵ گ ب، ستیانہ جڑانوالا روڈ، فیصل آباد

رابطہ نمبر: 0304-1569835

0318-7035935

ARI ID: 1688708536651

کوزہ گر دیکھیے کیا شکل مجھے دیتا ہے
اس کے ہاتھوں میں ہوں اور چاک پہ رکھا ہوا ہوں

ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ

OPEN ACCESS

CC BY

ECO FRIENDLY

Licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

انتساب

اپنے ابو کے نام، جن کے ساتھ ایک دن پُل کے پار سلسبیل کے کنارے بیٹھ کر، اشجار کی چھاؤں میں، پرندوں کے چہچہوں کے درمیان، پھولوں کی مسکراہٹوں کے درمیان، ان کے کان میں آہستگی سے بہت سے راز بتانے ہیں، جن کی دھنوں نے مجھے مگن کیے رکھا وہ ساز بتانے ہیں، اور بنا روئے یہ بھی بتانا ہے ''ابو آپ کی یاد بہت آتی تھی، مگر آپ کسی روز نہ آسکے''

اپنی بڑی امی کے نام جو ایک بزرگ پیڑ تھیں جو نہ بھی ہو تو اس کی شفیق چھایا کا احساس جلتے ریگ زار میں بھی ساتھ ہوتا ہے۔ مگر میں اپنی اس مسکراہٹ پر رو رہا ہوں جب آخری بار تصویر کھینچتے ہوئے وہ کہنے لگیں ''کھچ لے، کھچ لے، مر جاواں گی تے دیکھ لیا کریں'' ساتھ ہی میں مسکرا دیا اور کچھ دنوں بعد وہ بھی جنت کی کسی کیاری میں پھول اگانے کو چل دیں۔

دشمن جلد ہی کھل جاتے ہیں
اوران کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کہتے ۔۔۔۔۔
اپنی وفاداری میں شہرہ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
وہ تو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں
کہ
ایک سہانی صبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں
(ظلِ الٰہی کے پرابلمز ۔۔۔ پروین شاکر)

فہرست

بابِ تاثیر سے انجیلِ کربلا تک	۰۹
حرفِ خاک	۱۳
خوبیوں کے اظہار کا مرقع۔۔۔منان لطیف	۱۴
منان لطیف۔۔۔نئی نظم کا ہم مزاج	۱۵
چاک سے اتری خاک	۱۶
۱۔ دستِ فراخ	۱۹
۲۔ اعتراف	۲۱
۳۔ سمندر کا قان	۲۳
۴۔ زہر رگوں میں اتارنا پڑتا ہے	۲۴
۵۔ زندگی سے ہارا آدمی	۲۶
۶۔ نکلنا خلد سے آدم کا	۲۸
۷۔ لاتفسد فی الارض	۳۰
۸۔ صبر کا کفن	۳۲
۹۔ رشتے برائے فروخت	۳۶
۱۰۔ ایک بے لذت خواب	۳۸

۱۱۔ پتھریلے شہر	۴۰
۱۲۔ حزیں حرف گر	۴۳
۱۳۔ سنتورانی	۴۷
۱۴۔ آوارگانِ خاک	۴۹
۱۵۔ میری ماں نہیں رہی	۵۲
۱۶۔ دریوزہ گری	۵۴
۱۷۔ واپسی	۵۷
۱۸۔ ریزۂ ریگ	۵۹
۱۹۔ کتاب اور محبت	۶۲
۲۰۔ ہونٹ ناز پرور کے	۶۸
۲۱۔ چار پہیے اور گھر	۷۰
۲۲۔ غم کی بارشیں	۷۲
۲۳۔ گلِ امید	۷۴
۲۴۔ حزیں حرف گر (۲)	۷۶
۲۵۔ بیزار چھپکلیاں	۷۹
۲۶۔ جنم دن	۸۰
۲۷۔ کشمکش	۸۱

۲۸۔ ہوٹل میں ایک شام	۸۲
۲۹۔ ہم کیسے جی رہے ہیں؟	۸۴
۳۰۔ جلتا ضبط	۸۷
۳۱۔ انتظار	۸۸
۳۲۔ ہم ہر لمحہ فسوں میں ہیں	۸۹
۳۳۔ قیاس آرائیاں	۹۱
۳۴۔ تسلی	۹۲
۳۵۔ وقت گزاری	۹۳
۳۶۔ حزیں حرف گر (۳)	۹۴
۳۷۔ نارسائی	۹۶
۳۸۔ عیدی	۹۸
۳۹۔ آتم کتھا	۱۰۱
۴۰۔ کاروانِ زنبور	۱۰۴
۴۱۔ مے کدہ	۱۰۸
۴۲۔ یہ پیار کیا ہوتا ہے؟	۱۱۰
۴۳۔ تاشی تصویر گر	۱۱۱
۴۴۔ نجانے کس لیے	۱۱۴

۴۵۔ دروازہ	۱۱۷
۴۶۔ آخر کیا ہے زندگی؟	۱۲۰
۴۷۔ میں اور تُو	۱۲۲
۴۸۔ تنہائی	۱۲۳
۴۹۔ قید	۱۲۴
۵۰۔ بدصورت غربت	۱۲۵
۵۱۔ دیواریں	۱۲۷
۵۲۔ محرومیوں کی گٹھڑی	۱۲۹
۵۳۔ تندور رہک رہا ہے	۱۳۱
۵۴۔ کھوکھلی محبت	۱۳۳
۵۵۔ ایک کمی	۱۳۵
۵۶۔ مجبور	۱۳۶
۵۷۔ کسے معلوم انجام محبت	۱۳۷
۵۸۔ پہیہ	۱۳۹
۵۹۔ بابو	۱۴۱
۶۰۔ بدتر غلام	۱۴۳

☆☆☆☆☆☆

بابِ تاثیر سے انجیلِ کربلا تک

کائنات میں موسموں کی موجودگی سے طرزِ تکلم کے درجاتی دائروں کی دنیا ہو یا جذباتی سولات سے یقین کے منظروں میں شرطوں کی بحث، یہ کبھی بھی لذتِ تاثیر سے خالی نہیں ہوتی۔اس میں آرادھنا، سادھنا کے معنوی تجربات بھی شامل ہوکر، فکر کے داخلی رجحان کے ساتھ پھولوں کے رنگوں کی گرہ کھولتے ہیں۔یہ جوازِ احساس کی خارجی خصوصیات کو جب آرادھنا کے سبز پتوں میں لپیٹ کر الہامیہ نفسیات کے زاویوں میں سموکر، ماضی کے تخلیقی اور موجودہ دور کے تحقیقی دروازے کھولتے ہیں تو سوچوں کے رویوں پر اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ لذتِ تاثیر اور تحقیق ''اپنے عہد کی زندگی کا سامنا کرنے اور اسے تمام امکانات وخطرات کے ساتھ برتنے کا ہنر سکھاتی ہے۔ جسے جدت کے نام سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ ہر عہد میں جدیدت ہم عصر زندگی کو سمجھنے اور برتنے کے مسلسل عمل سے عبارت ہوتی ہے۔اس لحاظ سے جدیدیت ایک مستقل عمل ہے۔جو ہمیشہ جاری رہتا ہے۔'' (جدیدت اور ادب، وحید اختر)

ادبی کائنات میں جو تحیر اور طلسم سے سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ آرادھنا، سادھنا کے ساتھ مناجاتوں تک چلا آتا ہے۔پھر کیفیاتی اسرار شروع ہوتے ہیں۔جن کی وجہ سے عکس فسوں اسرار آگہی کی کرنوں میں ڈوبے سبز پتوں کا صحیفہ کھلنے لگتا ہے۔جس کی وجہ سے فکری سوچ کی وادیوں میں نفسیاتی مقامِ مقدسہ نظر آنے لگتے ہیں۔کبھی خود سپردگی کی ہئیت تو کہیں اسیر خواب ومن الشباب کی جلی، خفی جذبات کی بارشوں میں بھیگی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

اس سارے منظر نامے میں بکھری اساطیری رمزوں اور جدید اشاروں کو علمی دائروں میں پرکھنے کے ساتھ مختلف مفاہیم اخذ کیے جاسکتے ہیں لیکن آوارگی کے استعارے کے لیے مختلف راہوں کا، خیالوں کی شرطوں سے جنم لیتی فکری سوچوں کا، گردشِ ایام سے بدلتے ذہنوں کا ہونا ضروری ہے۔یہ تکون مضبوط ہوگی تو آوارگانِ خاک کے نظریات وتجربات سے خاک میں موجود عناصر کی توڑ پھوڑ سے پیدا ہونے والی اس

توانائی کا بخوبی پتہ چل جائے گا جو سورج کی شعاعوں سے فیض یاب ہو کر چاندنی راتوں میں چمکتے ذروں کی طرح نظر آتے ہیں۔ کچھ احبابِ مقدس ان کو سنگریزے کہیں گے لیکن ذاکرین وفا انہی کو سوچتے ہوئے بابِ تاثیر سے انجیل کربلا تک سبز شہر کا صحیفہ پڑھتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ ایسے صالحین کا مطالعہ کرنے والوں کی تخلیقی سوچ تنقید برائے مخالفت سے متصادم ہو کر تنہائی پر کاری ضرب لگاتی ہے۔ جس کی وجہ سے دو راستے جنم لیتے ہیں۔ ایک بہار کی جانب نکل جاتا ہے دوسرا خزاں کی طرف۔ جو ذہن ان دونوں راستوں سے کترا کر نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ رہبانیت، تیاگ، خانہ بدوشی جیسے اعزاز سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی کے تشدد سے زمین برد ہو جاتا ہے۔

آوارگانِ عصر ہوں یا آوارگانِ خاک یہ معاشرتی شعور سے حقیقی فلسفے کی رہبانیت کی طرف چلتے رہتے ہیں۔ جو انسانی سوچ کی اہمیت کو پرکھتے ہوئے پرندوں کی نثری نظمیں سنتے ہیں۔ پھر معانیوں کی تشریح و تفسیر میں حقیقت و مجاز کے زاویوں میں پھولوں جیسا رنگ بھرتے ہوئے، تنہائی سے سرگوشیاں کرتے ہیں حالانکہ یقین و گمان کی تشکیلی روایت کے افاعیلی نظریات کے لاتعداد صحیفے موجود ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ستاروں کی سن کر دل کی باتوں پر بحث نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک تنقید سے اکثر سبز شاخوں کی رگیں کٹ جاتی ہیں۔ یوں نثری نظم کی خوبصورتی کو بگاڑنے والے کی دھڑکنوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ شمسی چمک اور علامتی تعجب کے نظمیہ معانی ریڑھ کی ہڈی جیسے ہوتے ہیں جن کو تنقید میں شامل کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن نتیجہ نظمیہ سوچ کے برعکس بھی ہو سکتا ہے مگر اس سے انکار ممکن نہیں۔ قدیم حیثیت سے آنے والی صنف میں وقت کی پیش گوئیاں بھی موجود ہیں، جن سے یقین کی راہیں ہموار ہوئیں لیکن اس کو جھٹلانے والا راندۂ ادب ہو جاتا ہے۔ جو پھر ''جنات والناس'' ہو کر روزِ ازل سے روزِ ابد تک اپنی فطرت اور خصلت کا اظہار کرتا رہتا ہے کیونکہ اسے ''کیفیتِ کن'' اور ''حقیقتِ کن'' سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنی مطالعاتی طاقت اور معنویاتی توڑ پھوڑ میں مشغول رہتا ہے۔ ایسے لوگ لفظ ''نثر'' کے مفہوم کو کبھی فاعلاتی سوچ کے تشبیہاتی شعور سے ملاتے ہیں۔ کبھی سرخ سبز خیموں کو جلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ معانی و روانی کی چادر کو نیزوں میں پرو کر باغی باغی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ نثری نظم کو بازاروں میں سنگسار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گردشِ ایام سے ''گردشِ خاک'' تک نثری نظم حقیقت بن کر موجود رہی ۔لسانی تعبیرات کے منظروں میں یقین وجذبات بدلتے رہے ڈر،خوف کی حقیقت بھی مختلف شکلوں میں واضح ہوتی رہی لیکن یہ انسانی جذبات کو اپنے حصار میں لے کر رقصِ وحشت سے رقصِ جمال تک زعفرانی فسوں کے ساتھ محوِ سفر رہی ۔یونانی خانقاہوں سے عجمی غاروں تک کی دیواریں گواہ ہیں کہ نثری نظم کسی نہ کسی شکل میں اپنے وجود کا احساس دلاتی رہی۔

یہی نثری نظم وینس کی پجارنوں کے لبوں پر،آتش کدوں میں مختلف پھل لے کر جانے والیوں کی دھڑکنوں میں سما کر سناٹوں میں گونجتی رہی۔سب سے پہلے کس نے خط لکھا اس کی کھوج میں ریشمی رومال کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا۔نثری نظم کے حوالے سے میں ان تمام باتوں سے متفق ہوں۔''گردشِ خاک'' کو سامنے رکھتے ہوئے صدیوں سے فکری استعاروں اور جذباتی تلازموں کے ساتھ سوچ اور لفظوں کی معنوی روانی کا انداز بدلتا رہا۔جس کی بنا پر شعوری لوح پر،نفسیاتی قلم کی روانی پر ناقدین نے تنقیدی بازار گرم رکھے۔عصر رواں کے شہروں میں کئی مجدد اور مفسر لال پیلے ہوتے رہے اور سحر کے زاویوں میں گلابی شاموں تک کا سفر جاری رہا۔سرد ہواؤں سے گلے ملتی خوشبو داخلی اور خارجی راستوں پر سفر کرنے والے حرف ومعانی کے طرزِ حجاب اور شعورِ گلاب جیسی تسبیح پڑھنے والے چہرے بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔انھی چہروں کی وجہ سے مہاجر پرندوں کا تنکا تنکا چن کر لانا پھر چاندنی راتوں میں درویشوں کے مکاشفوں پر بحث کرتے ہوئے ،ایجاب وقبول کرتے ہوئے ،ارضی امانتوں میں نثری نظم کی شکل میں جذبات کو سمونے کی روایت بہت پرانی ہے۔جس سے پروفیسر فرینکلن بھی متفق ہیں۔بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''نثر سے نثری نظم بہتر ہے''اس جیسے اور بھی اقوالِ زریں مجدد اور امام تابوتِ سکینہ میں حفاظت سے محفوظ کرتے رہے تا کہ آئندہ نسلیں ان سے مستفید ہوسکیں۔سبز کلیمی رہبر کی پیش گوئیوں میں ان پودوں اور شاخوں کی باتیں بھی ہوتی رہتی تھیں جن کے زائیلم اور فلوئیم کے راستوں میں قلم آسودہ حال ہوکر سبز پتوں میں کھلنے والے پھولوں کی گواہی سے عیاں ہوکر،صفحوں کے سینے پر احوالِ بقا لکھتا تھا۔

عام طور پر واقعاتی سیلاب ،نظریاتی طوفان کچھ لوگوں کی سوچوں کو مفلوج کر دیتے ہیں اور کئی جملوں

سے منسلک معانی کو سامنے رکھتے ہوئے ،نظریاتی اور تجرباتی سلسلوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے محروم سوچوں کو اجسامِ مکانی کے رشتوں کے ساتھ کائناتی کشش میں الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس مقام پر شعوری سیاق وسباق کام نہیں کرتا بلکہ کسی سیلانی،آواراہ سے رجوع کرنا ضروری ہوتا ہے، جو سیاح یا آواراہ گرد کی گرہیں کھول سکے۔اس سلسلے میں شاعرانہ تکلم طبیعاتی موسم کے تابع نہیں ہوتا یہاں تو صرف دو قانون ہیں نظریاتی سلسلہ یا تجرباتی اصرار، جو عارفانہ روانی کو اعترافی کیفیت سے ہمکنار کرتے ہیں۔کلاسیکی روایتوں کی باتیں زیرِ بحث آ جاتی ہیں لیکن جبریت کا رجحان ،سیاسی اور سماجی استعاروں کے حوالے ،نظمیہ اور نثمیہ کے مقام کے ساتھ طرزِ استدلالی کو جوڑ دیتا ہے۔اسی وجہ سے بعض دفعہ وارثانِ ادب سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ نثری نظم امکانی فطرت کے سلسلے کو جذباتی فکر پر تقسیم نہیں کرتی۔بہار کے آنے جانے کے اسرار کو سامنے لاتی ہے۔یقین کو برباد نہیں کرتی۔آوارگانِ عصر ہوں یا ''گردشِ خاک'' کے مارے ہوئے سب یقین کو سامنے رکھتے ہوئے گمان کو ختم کر دیتے ہیں۔ادبی سرمائے میں بہت کچھ موجود ہے مگر ہر کوئی اس سے فیض یاب نہیں ہو پایا۔منان لطیفؔ ایک حوالے سے تاریخی شعور کی تہیں کھولتے ہوئے زمانوں کے ترتیبی عناصر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔''گردشِ خاک'' کی اکثر نظموں میں موضوعاتی چناؤ تخلیقی ابلاغ کے ساتھ کیفیاتی اظہار میں ڈھلتا ہوا،اعتباری تسکین کو تشکیل دیتا نظر آتا ہے۔منان کی نظمیں اساطیری تصوف کے ساتھ جذباتی احساس اور عصری روایات کو خوبصورتی سے پیش کرتی نظر آتی ہیں۔وہ مزاجِ قدیم سے جدید تک آتے ہوئے تصوراتِ عشق کے سبز و سرخ مقامات کی بے حرمتی کرتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ لفظی بنت کاری اور معنوی روانی کے ساتھ دعائے عفت اور عالمِ تاثیر کے صندلیں جنگلوں میں نثری نظم کی داخلی اور خارجی کیفیات کی تکمیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کی نظموں کا علامتی رنگ فکر اور احساس کے جنگلوں سے گزرتا ہوا شہروں کی وحشت میں داخل ہوتا ہے اور مشاہداتی اشاروں کے ساتھ عہد بہ عہد شدت جذبات پر محیط ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

منصفؔ ہاشمی ،فیصل آباد

حرفِ خاک

اردو شاعری قدیم روایت کی حامل ہے ۔جس میں ہر شاعر نے اپنا حصہ ڈالا ہے ۔شاعری کی حساسیت اسے مجبور کرتی ہے کہ معاشرتی جبر کو بیان کرے۔اس کے لیے تشبیہات واستعارات ایسے مورچے ہیں جس کی آڑ میں وہ جبر، بربریت کو بآسانی بیان کرسکتا ہے۔

جب ہم منان لطیفؔ کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں تو کائنات اور اس کے باسیوں کی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے۔آوارگانِ خاک تب سے اب تک اور اب سے نجانے کب تک گردشِ ایام کی دبیز تہوں میں غوطہ زن ہوتا رہے گا اور چار پہیوں کی تلاش میں مقامِ انسانیت کھوتا رہے گا۔احساسِ برتری ایک ایسا زہر ہے جسے انسان ناز پرور ہونٹوں سے اپنے رگ و پے میں اتارتا چلا جاتا ہے۔

''گردشِ خاک''میں انسانیت سسکتی بلکتی نظر آتی ہے ۔جیسے یہ جہان تندور کی مانند ہے جو اس میں داخل ہوتا ہے وہ اس میں جلتا دکھائی دیتا ہے۔شکاری جال پھیلائے ہر لمحہ شکار کے منتظر ہیں۔انسان آزاد و خودمختار ہو کر بھی پابہ زنجیر نظر آتا ہے۔چھپکلیوں کی طرح حرص، ہوس، لالچ ،بغض اور کینہ پروری کی دیواریں چاٹتا نظر آتا ہے۔

ایک طرف انسان قیاس آرائیوں میں چپ چاپ صبر کا کفن اوڑھ لیتا ہے ۔کئی سنتو رانیاں پریمی کے انتظار میں زندگی کے دن گن گن کر اپنی لٹیں اداس اور چھاتیاں خشک کر لیتی ہیں ۔منان لطیفؔ کی نظموں میں یہ احساس خاصا گہرا ہے، جو دراصل حالات وواقعات کی تصویر کاری ہے۔

ڈاکٹر محمد یسین رازؔ

شعبہ اردو

ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

خوبیوں کے اظہار کا مرقع۔۔۔منان لطیفؔ

انسان جس امر کی کوشش کرتا ہے،اس میں مسلسل محنت کے ساتھ جستجو اور خوب سے خوب تر کی لگن کی بدولت کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام کی یہ خامی رہی ہے کہ طلبہ کسی بھی مضمون میں حادثاتی طور داخلہ لیتے ہیں اور پھر محنت سے جی چراتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ایسا نظام بھی رائج نہیں کہ طلبہ اپنے مضمون میں عملی مہارت اور دسترس رکھتے ہوں۔اس لیے بہت کم طالب علم اپنے مضمون سے انصاف کر پاتے ہیں۔منان لطیفؔ کا شمار ایسے طلبہ میں ہوتا ہے جو ذوق وشوق،محنت ولگن اور تلاش وجستجو کو اپنا شعار بنا کر اپنے مضمون میں دسترس حاصل کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ان کا جوش و جذبہ اوائل میں ہی جھلکنے لگتا ہے اور محنت رنگ لانے لگتی ہے۔چنانچہ ان کے ذوق وشوق کی پہلی جھلک ''گردشِ خاک'' کی صورت میں دیکھی جاسکتی ہے۔جو اس کے بعض گُن اور خوبیوں کے اظہار کا مرقع ہے۔منان لطیفؔ کو شاعری سے شغف ہے اور نثر پر مہارت ہے۔چونکہ شاعری کے لیے طبع مناسب کے ساتھ ساتھ بعض تکنیکی امور بھی شامل حال ہوتے ہیں،اس لیے ابتدائی طور پر نثری اظہاریے یا نثری نظم کی طرف توجہ کو معیوب خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اصل مقصد اظہارِ ذات ہے جو انسان کو کئی نفسیاتی اور معاشرتی عوارض سے محفوظ رکھتا ہے۔اگر اس کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو بعض مواقع سے قطع نظر اس کا جوہر کھلتا دکھائی دے گا۔لفاظی،لفظ تراشی،لفظی بازی گری اور تراکیب سے واضح ہوگا کہ زمینِ ادب سے نکلنے کو بے تاب یہ ننھا پودا چھتنا ور درخت بننے کی بھرپور اہلیت رکھتا ہے۔شجرِ ادب سے پھوٹتا یہ ننھا غنچہ خوبصورت شگوفہ بننے کی بھرپور صلاحیت کا حامل ہے۔یہ گلاب کھل کر چاردانگ عالم کو اپنی مہک سے مسحور کر دے گا۔

ڈاکٹر محمد احمد خاں

صدرِ شعبہ اردو

گورنمنٹ میونسپل گریجوایٹ کالج،فیصل آباد

منان لطیفؔ۔۔۔نئی نظم کا ہم مزاج

نثری نظم اپنے تشکیلی دور سے نکل آئی ہے اور اب ایک زرخیز روایت کی مالک ہے۔اس روایت میں فکر و خیال اور شاعرانہ اسلوب کے مظہر کئی تخلیق کار نثری نظم کے معمار ہیں اور انہی معتبر نثری نظم نگاروں کا فیض ہے کہ اکیسویں صدی میں نثری نظم میں جدید حسیات کی عکاسی ملتی ہے اور اب اسے ایک سنجیدہ اظہاریے کی سند مل چکی ہے۔نثری نظم تخلیقی اور شعری اسلوب میں منفرد اور تازہ خیال کی شاعری ہے۔انہی صفات کی بنا پر یہ نثر کے مزاج سے مختلف ہونے پر اصرار کرتی ہے۔یہ انفراد نثری نظم کا جواز بھی ہے۔اسی لیے غزل اور موزوں نظم میں پہچان بنانے والے شعرا بھی نظم کو اپنا چکے ہیں۔نثری نظم کی روایت کے لیے خوش آئند امر یہ ہے کہ نئے تخلیق کار بھی اس صنف کی روایت سے وابستہ ہو رہے ہیں۔جن کو یہ شعور ہے کہ شاعری کے لیے وزن نہیں بلکہ شعریت شرط ہے۔منان لطیفؔ بھی ان تازہ دم، جواں سال و جواں فکر شعرا کی صف میں شامل ہیں جو نثری نظم کے ہم مزاج تخلیق کار ہیں اور اس نازک صنف کے تقاضوں کا ادراک رکھتے ہیں۔ان کا تخلیقی وفور نثری نظم کے اسلوب کے سانچے میں اپنی حسیات کو شاعرانہ لہجے میں اظہار نے کی طلسم کاری سے منور ہے۔ان کی نظمیں شعری بصیرت سے لے کر شعری اسلوب کی تشکیل کے رویوں کی عمدہ مثالیں ہیں۔اس لیے ان نظموں کی قرأت کے دوران میں قاری کی ذہنی کیفیت احساس کی نئی بستیوں سے آشنا ہوتی ہے۔یہ وہ ہنرمندی جو نثری نظم کا جواز ہے۔اس لیے مجھے یقین ہے کہ مذکورہ اوصاف کی اساس پر منان لطیفؔ کا مجموعہ ''گردشِ خاک'' نثری نظم کو ایک نئے ذائقے اور اعتبار سے آشنا کرے گا۔

ڈاکٹر اسحاق وردگ (صدرِ شعبہ اردو)
گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج، تیمر گرہ
ضلع دیر پائیں، خیبر پختونخواہ

چاک سے اُتری خاک

ابھی آنکھوں کے دریچے کم سن اور عقل کے جگنوؤں کی روشنی مدھم تھی، جب دل کی تاریک گلیوں سے یہ خیال اکثر کسی انجان مسافر کی طرح گزرتا کہ یہ بھٹکے ہوئے لفظوں کے سوداگر یونہی کہنہ کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ان کی سطریں طلسمی افسانوں کے سوا کچھ نہیں۔ان کی باتیں فریب کی واضح دلیلوں کے سوا کچھ نہیں۔ بھلا لفظوں کے لمس سے کسے شفا ملی ہے؟ بھلا جملوں کی تپش سے کب پتھر پگھلے ہیں؟ مگر اک روز میں اداس شام کے غمزدہ حجرے میں جونؔ کے صحیفہ ''شاید'' میں موجود غزل (نیا اک رشتہ پیدا کیوں کریں ہم) کے ابتدائی اشعار کی قرأت میں منہمک تھا تو مقدس پردوں میں لپٹی، پہلی معصوم آیت نے مجھ پر کھلتے ہوئے گواہی دی ''یہ خدا کے چنیدہ لوگ ہیں''۔

دوستی جو کبھی محبت کے مہکتے پھولوں کا جزیرہ ہوتی تھی۔اب دلکش مگر آتشی سانپوں کا جنگل بن چکی ہے۔میں چاہتا تو لفظوں کی بین کے زور پر منتروں سے جکڑی پٹاری میں انھیں قید کرسکتا تھا لیکن دانستاً ایسا نہیں کیا۔ یہ یونہی چاہت کا ملاوٹی دودھ پی کر نیلی رگوں میں زہر اتارتے رہیں۔میں نہیں چاہتا تھا یہ سانپ جن کی مفادی آستینوں میں پل رہے ہیں وہ میرے چاکِ گریباں کو اور تار تار کریں۔

میں اکثر سوچتا اگر خدا نے یہ جدید حرف گر (ن۔م راشدؔ، مجید امجدؔ، میراؔجی) نہ بھیجے ہوتے، تو میرے لیے بھٹکنا کتنا آسان تھا۔میرے بہت سے ژولیدہ خیالات اور کومل جذبات الفاظ کا پیراہن زیب تن کیے بنا غزل کی روایتی گلیوں میں سراسیمگی اوڑھے دربدر کی ٹھوکریں کھاتے یا پھر کسی روز دل و دماغ کی کسی کنج میں لاوارث لاش کی طرح پائے جاتے۔

اگر میں دیکھوں تو گھومتے چاک سے جز چند خاکی چہرے اتارنے کے کچھ نہیں کیا۔ان محرومیوں کے پژمردہ چہرے جو ازل سے بنی آدم کے دل میں سسک رہی ہیں۔ان حسرتوں کے آشفتہ چہرے جو ابد تک بلکتی رہیں گی۔زمانے کے تلخ حقائق کے چہرے جس میں کوئی بھیگی بلی تو کوئی وحشی بھیڑیا بنا ہے۔اس

بوڑھی تاریخ کا چہرہ جو دن بہ دن وقت کی جھریوں سے ڈھلک رہا ہے۔اپنے اس غم نہاں کا چہرہ جس میں دھنسی مغموم آنکھیں کسی کا غم دیکھتے ہی بھیگ جاتی ہیں۔

یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں کہ وہ غریب کی کٹیا کو نگلتا اندھیرہ قرطاسِ ابیض پر پھیلا سکے۔محلوں کی تیز روشنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکے۔غموں کی تمازت سے تپتے آنگنوں کو آسودگی کے چھتنار درختوں کا سایہ فراہم کر سکے۔ویران مکانوں میں سوئی مکڑیاں جگا سکے۔معاشرے کے بگڑتے چہرے کو جملوں کے غازے سے نکھار سکے،خواہشوں کی ماری دوشیزہ کے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لا سکے۔کسی خاموش منظر کو سچے رنگوں سے ابھار سکے۔لطیف احساسات کو شیریں زبان عطا کر سکے۔کسی کے حسین خدوخال کو لفظوں کے قلمِ ناقلہ سے تراش سکے۔یہ تو خدا کی دین ہے جسے چاہے دان کر دے۔

رفتگاں کے شکستہ کھنڈرات سے گزرتی تباہ شدہ لمحوں سے بنی یادوں کی کچی سڑک کو پہلی بارش کی ننھی بوندوں کے چومنے سے جو بھینی بھینی مہک اٹھتی ہے،ایسی ہی احساس سے لبریز خوشبو مجھے دو اساتذہ سیف الرحمٰن خاں بلوچ اور ڈاکٹر عارف حسین عارفؔ صاحب کی صورت میں عنایت ہوئی،جس سے برسوں سے مرجھائی روح میں رعنائی در آئی،جسم کے غنودہ مسام جاگ اٹھے۔میں لوحِ شکر پہ محبت کے روشن قلم سے لکھی تمام سنہری تحریریں ان کے نام کرتا ہوں۔

میں یوں تو نہیں کہوں گا کہ میری ہر سطر میں ایک بحرِ بیکراں چھپا ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ ہر سطر میں ایک قطرۂ متلون ضرور پنہاں ہے۔جو خاک کے تشنہ ذروں میں ضم ہو جانے کا منتظر ہے۔اگر آپ کو اس خاک کی گردش سے بنتے ہوئے چہروں میں اپنا چہرہ نظر آئے تو اس خاکسار کو اپنی دعاؤں میں یاد کر لیجیے گا کیونکہ ہر چہرے کے پیچھے کئی چہرے چھپے ہوتے ہیں۔

منان لطیفؔ

شعبہ اردو

گورنمنٹ میونسپل گریجوایٹ کالج،فیصل آباد

کٹی ہے عمر کسی آب دوز کشتی میں
سفر تمام ہوا آنکھوں نے کچھ نہیں دیکھا
افتخار نسیم

دستِ فراخ

میں وہ تیرگی ہوں
جس کے واسطے
آسماں کو چیرتے
اک نورِ عظیم سے
دشت کی وسعتیں چمک اٹھیں
پہاڑوں کو چوٹیاں دمک اٹھیں
میں وجہِ قیامِ طویل ہوں
کہ شب بھی رو پڑے
خدا بھی پکار اٹھے
بس کیجیے! بس کیجیے
میں وہ خاکِ خوش نصیب ہوں

جس پہ تحائفِ سماوی کا نزول ہے
میں آنسوؤں سے تر وہ دعا ہوں
جسے ازل سے اندیشۂ رد نہیں
جو فقط قبول ہے، قبول ہے
میں وہ غمِ بختیار رہوں
جسے دلِ اطہر کی پناہ ملی
وہ راہ نور رہوں
جسے روشن نگاہ ملی
بس اب اتنی ہے آرزو
پاک فضا میں سانس لوں
زمزم میرا مشروب ہو
سایۂ سبز تلے پڑا رہوں
اور جب ہو عالمِ تشنگی
ساقیِ دو جہاں کے دستِ فراخ سے
وہ جامِ تمنا نصیب ہو
جس کی سدا تمنا رہی

اعتراف

میں دو دیوتاؤں کا بھگت
جنھوں نے میرا بخت چمکایا
پہلا دیوتا جس کا مندر
جیسا باہر ویسا اندر
جہاں محبت کی شمعیں جلتی ہیں
درد کے سنکھ بجتے ہیں
جس کی کشتِ سخن زرخیز ہے

جس میں گلاب و سمن مہکتے ہیں
اور مرغانِ خوش نوا چہکتے ہیں
میرے اندر کے تار بجتے ہیں
مجھے ذوقِ ادب کا خزانہ دیا
لکھنا، پڑھنا، بولنا سکھایا
اظہار و بیان کا سلیقہ سمجھایا
پھر میں ایک ایسے دیوتا کے سپرد ہوا
جس کا مندر دیوتاؤں کا عجائب گھر
جہاں شعور و فکر کے دیپ جلتے ہیں
جہاں علم و سخن کے گجر بجتے ہیں
جس نے میری تپسیا کو بھاگ لگائے
میرے لفظ و معانی کو راگ دیے
میری سوچ کو پر لگائے
لفظوں کے جنگل سے خیال و معنی کے پھول چننے کا سلیقہ سکھایا
مجھے تو دوئی راس آ گئی
یعنی مجھے پیاس بھا گئی

سمندر کا قانون

سڑک کے ساحلی کنارے پر
چھوٹی مچھلیاں قسمت کی ریڑھی پر ضرورت کے کھلونے سجائے
کنڈی سے لالچ کا چارہ لگائے
قدِ رِزر میں اضافے کے گُر آزما رہی ہیں
بڑی مچھلیاں سڑک کے سمندر میں
تیز رو گاڑیوں میں بہتی
ان کو اُچکتی، نگلتی اور روندتی
ہارن کے ڈکار بجاتی ہوئی
بے سمت سفر پر رواں ہیں
سمندر کا یہ قانون اب خشکی پر بھی چل رہا ہے
الٰہی کوئی سونامی۔۔۔۔!
کوئی صرصر۔۔۔۔!
کوئی انقلاب۔۔۔!

زہر رگوں میں اتارنا پڑتا ہے

تپتے سورج کی کرنوں کے نوکیلے پتھر
فگار دن کے برہنہ سر پر برس رہے تھے
ریل کی پٹڑی کو کاٹتی ہوئی کہنہ سڑک پر
انبوہِ آدم رواں دواں
قریب ہی پُل کے نیچے بیٹھے دھوئیں میں پریشاں حال
اپنے وجود کو تلاشتے چند انسان
موت کی آغوش میں پلتے ہوئے
دشت نما چہروں پر بے خوابی کی جھریاں
بدقسمتی کی دھول میں اٹے ہوئے بال
بوسیدہ پیراہن سے جھانکتا استخواں
آنکھوں میں خمارِ آشفتگی
جس میں ٹھکرائے جانے کا غمِ جاوداں پنہاں
اس ہجومِ آشفتگاں سے ایک ژولیدہ مو

اپنی رگوں میں زہر اتارنے لگتا ہے
زندگی بے اختیار چیخنے لگتی ہے
اے دشمنِ جاں یہ کیا۔۔۔؟
آشفتہ نوا گویا ہوا
سن اے زندگی!
''خدا نے فقط تجھے عطا کر کے
بدلے میں مجھ سے کیا کچھ نہیں چھینا
اُس کے بے اماں جہان میں
رشتے بکتے ہیں
جذبات کا بیوپار ہوتا ہے
محبت بھیک مانگتی، تلوے چاٹتی ہے
جھوٹ مسکراتا ہے
سچ دریوزہ گر ہے
ہر کوئی نفرت کا خریدار ہے
اپنے بیگانے ہیں
یہ سب دیکھنے اور سہنے کے لیے
زہر رگوں میں اتارنا پڑتا ہے''

زندگی سے ہارا آدمی

میں نے طور پہ آدمی کو پکارا
تو ہانپتا ہوا بے بس چہرہ سامنے آ گیا
میں اس کا قصیدہ لکھوں
یا اس کی حالت زار کا مرثیہ بیان کروں
وہ آدمی جس کے حال پر، سوال پر، خیال پر
میں افسوس کے سوا کچھ نہیں کر سکتا
جس نے اپنے ظاہر کو روشن کرنے کے لیے باطن کو جلا دیا
زر بناتے ہوئے اصلِ زر کو بھول گیا

گھر کو ریستوران بنالیا اور پاؤں کو پہیے لگا لیے
گویا اپنے پاؤں کاٹ لیے
اس تیز رفتاری میں اتنا آگے نکل آیا کہ تنہا رہ گیا
اپنے وجود سے بیزار
زندگی سے ہارا ہوا
دوست میسر نہیں، بس یادیں ہیں
تصویریں دستیاب ہیں مگر بولتی نہیں
بس اتنا سا جواب ''وقت نہیں ملتا''
''بہت مصروفیت ہے آج کل''
کاش وہ تصویریں بھی بولتی جو دل میں بسی ہیں
کبھی مسکراتی، کبھی رنجیدہ ہوتیں
اب تو انسان بھی تصویر دکھائی دیتا ہے
میں اس تنہائی کے مارے آدمی سے اکتا گیا ہوں
ان روشن راتوں اور ان سیاہ دنوں سے گھن آنے لگی ہے
میرا دل تو اب مجھ سے وہی پرانا آدمی مانگتا ہے
محبت، پیار، خلوص اور ہمدردی سے بھرا، دانا آدمی

نکلنا خلد سے آدم کا۔۔۔

آس کی خوشبو یاس کی بدبو پر ہمیشہ غالب آتی ہے
یوں محسوس ہو رہا تھا
جیسے دل میں اِک آگ سی لگی ہو
اور سب کچھ اس بھٹی میں جھونک رہا ہوں
اس بھٹی کو صرف آنسو ہی ٹھنڈا کر سکتے تھے
لیکن! وہ بھی لبِ مژگاں تک آتے آتے مر گئے
کتنی مشکل سے محبت کے تار و پود سے سنہری خواب بنے تھے
مگر ایک تار کے نکل جانے سے
سب خواب نیند کی وادیوں میں کہیں کھو گئے ہیں
حیف! میرے دھندلے خواب
جو میں کسی کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا
یوں لگتا ہے جیسے
میرا بھی شمار اُن سوختہ سروں میں ہوتا ہے

جو بحرِ محبت میں بنا کشتی اور پتوار کے اتر گئے تھے

مجھے اپنی عادتوں پر دکھ ہے

جو پھر سے خراب ہو جائیں گی

جنہیں اک عرصہ بدلنے میں لگا تھا

یہ آدم اور آدم زاد کے نصیب میں لکھا جا چکا ہے

کہ اس کا کبھی ایک ٹھکانہ ہو ہی نہیں سکتا

کبھی یہ بہشت سے نکالا جاتا ہے

کبھی اپنے گھر سے در بدر ہوتا ہے تو کبھی شہر سے

کبھی کسی کی زندگی سے تو کبھی کسی کے دل سے

یزداں نے بھی انسان کے ساتھ کیا خوب کھیل کھیلا ہے

اسے فاصلوں میں الجھائے رکھتا ہے

جب یہ دھول اڑانے کے قابل نہیں رہتا

تو منزل نام کی گدّی پر بٹھا دیتا ہے

اُس کے نرم لہجے نے نجانے دل میں کتنے زخم لگائے تھے

پھر بھی اس کی یادوں کا انبار اٹھائے

تہی دست برہنہ پا، دل فگار

اُس کے کوچے سے نکلے تھے ہم

لا تفسدو فی الارض

گاڑی کے سائیلنسر سے کرپشن کا دھواں نکلتا ہے
ٹائروں سے چمٹی بے ایمانی کی دھول اڑتی ہے
گاڑی ٹھہرتی ہے
سیاہ شیشوں میں آنکھیں چھپائے
چہرے پر رعونت کے ماسک لگائے
سر پہ شرافت کی دستار سجائے
نفاق کی تسبیح پر سنگ دلی کے دانے پھینکتے

شیطان باہر آتے ہیں
مسجدوں میں تقویٰ کی نمائش ہوتی ہے
پرہیزگاری کے خول میں چھپے یہ بھیڑیے
خدائی فوجدار
گدھ کی مانند بنی آدم کے جذبات نوچتے ہیں
رگِ احساس کاٹنے کی ترغیب دیتے ہیں
اصلاح کے پردے میں چھپے ہوئے یہ فسادی فرعون
ہمیں ''میں'' اور ''تو'' میں بانٹتے یہ اشترا کی کوچہ گرد
ازل سے عصائے مذہب تھامے
بنی آدم کو ہانک رہے ہیں

صبر کا کفن

بخت میاں! ہم نے ایسا تغیر تو نہ چاہا تھا
ان گنجان راستوں پر
کوئی بھی صدائے غریب پر کان بھی نہ دھرے
جو اپنی زندگی کو گروی رکھے
قسمت کی ریڑھی لگائے
سیہ بختی کی صدائیں دیتا ہے
کبھی کبھی تنگ آ کر موت کو صدا دے بیٹھتا ہے
تو اچانک آواز آتی ہے
بخت میاں۔۔۔! ابھی خود کو آزماؤ
شام کے دھندلکے میں

جب وہ ژولیدہ مو، چاک داماں
خستہ حال و واماندہ
قسمت کے ٹھیلے کو دھکا لگائے گھر لوٹتا ہے
تو گھر کا بوسیدہ، دروازہ اسے دیکھ کر منہ بسورتا ہے
جس کے تختوں پر نحوست چمکتی ہے
ذرا سا ہاتھ لگانے سے چیخنے لگتا ہے
ایک ایک پاٹ، نشے میں ڈوبے شرابی کی طرح جھولتا ہے
داخل ہوتے ہی حوا زادی کی بے زار آواز کانوں میں چبھتی ہے
''شام کو رات نہ کیا کرو بخت!''
''اندھیرے میں چور ہوتے ہیں''
اے نصیب جلی تجھے کیا معلوم!
اب تو دن میں بھی کئی قسم کے معزز چور ہوتے ہیں
وردیاں پہنے ہوئے اکڑ کر چلنے والے چور
نوٹوں کی مالش سے منہ چمکائے ہوئے چور
کالے چشموں کے پیچھے کالے کرتوت چھپانے والے چور
بند کمروں میں عزتوں سے کھیلنے والے چور
ہمارے پاس ہے ہی کیا جو چوری ہوگا

سونے کو بستر تک تو ہے نہیں
ایک چھت ہے وہ بھی بارش کے بعد دیر تک آنسو بہاتی ہے
ایک زمین ہے جو ہمیں سہارا دیے ہوئے ہے
یہ بھی پاؤں تلے سے نکل جائے تو کیا کریں گے
کمرے کی ادھڑے پلستر کی دیواروں سے بیٹی کی یادیں چپکی ہیں
جو سفید لباس میں رخصت ہوئی تھی
ہمیں قرض کے بوجھ تلے دبا کر خود منوں مٹی تلے جا سوئی
''ارے بخت! یہ تو بتا''
''میری غریبی اس مٹی میں تھی، جس سے آدم بنایا گیا''
''یا زمین کی قسمت میں تھی جس پر اسے اتارا گیا''
''یا صرف ہماری قسمت ہی ایسی ہے''
''اس قدر سردی میں بھی ہمیں لحاف میسر نہیں''
اری بد بخت!!
ہمارا خون گرم رکھنے کو غربت ہی کافی ہے
یہ بوسیدگی ہمارے لحاف ہیں
گرم آہیں ہمارا بستر ہیں
منہ دھونے کے لیے گرم آنسو ہیں

ہم ضرورتوں کے اسیر ہیں
ہم تو خواب بناتے ہیں اور بیچتے ہیں
خود غربت کی دھوپ میں جھلستے، چھتریاں فروخت کرتے ہیں
ہمارے سیاہ طاقچوں میں رکھے دیے
ہماری غربت کی سیاہی اوڑھ کر سو جاتے ہیں
ہم بھوکے بھکاری
قسمت کا کشکول تھامے
خوابوں کی بھیک میں سرگرداں
عزت کی بخشیش کو ترستے ہوئے ہم دریوزہ گر
اس غریب پرور نے ہمیں کیسا غربت کے پھولوں کا ہار عطا کیا ہے
جو ہمارے لیے طوق سے بھی بدتر ہے
سانس لیتے ہوئے رگیں دبتی ہیں
زندگی دھندلی دکھائی دیتی ہے
موت بھی واضح نہیں ہو رہی
آخر کب تک ان برہنہ محرومیوں کا تن ڈھانپنے کے لیے
ہم زندہ رہیں گے
کب ہم صبر کا کفن پہنیں گے

رشتے برائے فروخت

آؤ.....آؤ.....خدا کے بندو!

عیش کے فرزندو

میں تمھیں آج ایک چیز دکھاؤں

ایک انوکھی، تمھارے مطلب کی چیز

جس سے تمھیں سکون ملتا ہے

اور لبوں پہ طنزیہ مسکراہٹیں سجتی ہیں

یہ لیجیے.....!

مفاد پرستی کی محبت

حسد کی آگ میں جلتے رشتے

ایذا کے کیچڑ میں لتھڑے رشتے
آنسو بہاتے اور سسکتے رشتے
پتھر کی طرح سخت، مگر کانچ سے نازک رشتے
بانسری کی طرح کھوکھلے، عداوت کے سُر نکالتے رشتے
پیاروں کے خون میں رنگے رشتے
جن کا کوئی نعم البدل نہیں
خلوص کا زہر اگلتے رشتے
ایسا زہر جس کا کوئی تریاک نہیں
سب..... لے جاؤ
اور بدلے میں چند مسکراہٹیں دے جاؤ
جو ان رشتوں کے باعث چھن گئی ہیں
چند خوشیاں دے دو
جو ادھوری خواہشوں کی مانند چبھ رہی ہیں

ایک بے لذت خواب

آ تجھے نیند میں بھیگے، مہکتے راستے سے لے جاؤں
رفتہ رفتہ اونگھ کے ہچکولے لیتے ہوئے
کہیں دور..... بہت دور
اپنے دل کے پاس
جب دل کی دھڑکن تیز ہو گی
تو بنا کسی آہٹ کے، تجھے خواب کی وادی میں اتار لوں
یہ وادی تیرے بدن کی خوشبو سے مہک اٹھے گی
جب آنکھوں پہ کیف و سرور کی چلمن گر پڑے گی
جب سانسیں جذبات کے پسینے سے شرابور ہوں گی

تو خواب کی اس وادی میں
چاہت کے اطلسی نرم و ملائم فرش پر
دو منکر روحیں آگ لگائیں گی
ساری وادی جل جائے گی
فقط راحت کی راکھ بچے گی
جو افسوس کی ایک آندھی چلنے پر
فضا کے ذروں میں مل جائے گی

پتھریلے شہر

میں شام کی اداس پگڈنڈی پر دن بھر کے تھکے سورج کی مانند بیٹھا تھا
''کیوں''۔۔۔۔۔''کس لیے''
میں اپنے وجود کی نفی کے بارے میں سوچ رہا تھا
منتشر خیالات کا سیلِ رواں رگوں میں محوِ گردش تھا
ذہن تاریک جھونپڑے کی مانند آزاردہ تھا
شوریدہ سری میری بینائی نگل چکی تھی
میں تصورات کے پتھروں سے ٹھوکریں کھاتا ہوا
اس جھونپڑے میں جا پہنچا جہاں کبھی زندگی ہار دی تھی

اچانک ایک ٹھوکر سے بینائی بحال ہوگئی
چاند نظر آیا تو اس سے گویا ہوا
''کیا ادھر آسمان پر ایک خدا ہے؟
یا ہماری زمین کی طرح الگ الگ ہیں
میری ماں کہتی ہے، ساری دنیا کا ایک خدا ہے
جو دور آسمانوں میں رہتا ہے
شہر آ کر معلوم ہوا ہر بندہ خدا ہے
یہاں آ کر لگتا ہے کہ خدا کے ہاتھ میں موت کے سوا کچھ نہیں
ہر شخص اپنی تسکین کے لیے دوسروں کے دل چیر رہا ہے
مصنوعی مسکراہٹوں سے ایک دوجے کو لوٹ رہے ہیں
شاید خدا بھی ان خداؤں سے اکتا چکا ہے جو ان کو کھلا چھوڑ دیا
یہ اناج اور تاج کے پجاری
جسے چاہیں عروج بخشیں، جسے چاہیں پستیوں میں پھینک دیں
ان کی دیواریں رنگ و روغن سے بھری ہیں
مگر ان کے دلوں میں دراڑیں ہیں
ہر سو وحشتوں کو راج ہے
شور مچاتی گلیوں میں سرخ آنکھوں والے بھیڑیے دندناتے ہیں

جن کے نوکیلے دانت جوان ہرنیوں کی لذیذ رانوں کے پیاسے ہیں
اونچی عمارتوں کے چمکتے فانوسوں میں قید روشنی
غریب کا لہو پی کر چہکتی ہوئی مشینیں
احساس سے عاری آدم زاد
بزرگوں سے سنا تھا انسان پتھر کے زمانے سے نکل آیا ہے
مگر اپنی کرچیاں چنتے ہوئے سوچتا ہوں
بزرگوں کو کیسے بتاؤں
وہ زمانہ پتھر کا تھا مگر اب لوگ پتھر کے ہیں''

حزیں حرف گر

جہاں گر!
فقط ایک تمنا مجھے بے قرار رکھتی ہے
میں تم سے ہم کلام ہو جاؤں
میرے کم مایہ الفاظ تیری سماعت کے منتظر ہیں
مجھے لگتا ہے، میں تیرا حصہ ہوں
تجھ سے جدا ہوا ہوں
کسی دن پھر آ ملوں گا

تو کتنا بے نیاز ہے

رات تیرے ایک اشارے پر دن کو اپنے بطن سے جنم دیتی ہے

موسم اپنی کوکھ چیر کر نئے موسم کو زندگی عطا کرتا ہے

اے آدم گر!

میری فریاد بھی سن

میں زمیں زاد، غم گزیدہ، تشنہ کام، آشفتہ نوا، تہی دست، برہنہ پا

سنسار کے ساگر میں غوطہ زن ہوتا ہوں

چند پراگندہ موتی پاتا ہوں

جو پتھر بن کر میرے سر پہ برستے ہیں

زندگی وحشت زدہ بچے کی طرح گھبراتی ہے

دن رات اور موسموں کا پھیر، سب فریب لگتا ہے

ایسا فریب جس میں ہر شخص خود کو دھوکا دے کر خوش نظر آتا ہے

میں خاک زاد مدت سے ان پتھروں کے بوجھ تلے جی رہا ہوں

میں نے زندگی کو لہو آلود دیکھا ہے

میں نے زندگی کی سسکیاں برداشت کی ہیں

سمندر کے کنارے پر

موجوں سے تنگ آئی خواہشوں کے مدفن دیکھے ہیں

اے عرش نشیں!
یہ کیسی نا آسودہ خواہشیں ہیں کہ انساں
کبھی یزداں نظر آتا ہے، کبھی انسان دکھائی دیتا ہے
ساحل پہ رینگتی ہوئی موجیں اس کے قدموں سے لپٹتی ہیں
سیپیاں اپنے موتی اس کی آغوش میں بھر دیتی ہیں
وہ سمجھتا ہے ساگر نے اپنا سارا خزانہ اس کے سپرد کر دیا ہے
اے جہاں ساز!
میں حزیں شبد گر
جب بھی اس پری پیکر کو لفظوں میں ڈھالنے لگتا ہوں
میرے الفاظ کی صورت بگڑتی چلی جاتی ہے
غربت و افلاس کے مارے ہوئے نحیف چہرے
آنکھوں میں گھومنے لگتے ہیں
سسکتے جسموں کی آہیں، بھوک سے بلکتے شیر خواروں کی چیخیں
میرے الفاظ کا بدن نوچتی ہیں
اس کی زلفوں کو ذکر کروں تو دھوپ سے بھرے آنگن یاد آتے ہیں
افلاس کی دھول میں اٹی گلیاں دکھائی دیتی ہیں
میرے یہ آزردہ لفظ تخیل کی پیداوار نہیں

یہ احساس کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں
غموں کے ڈھیر پہ پلنے والے لفظوں میں گلابوں کی مہک کیسے آئے
ایک ناچار ماں کی طرح لفظوں کو پالتا ہوں
روشنائی کا کفن پہنا کر گورِ قرطاس میں رکھ دیتا ہوں

اے جہاں باز!
میں نے روشن محلوں میں ٹھوکریں کھاتی اندھی زندگی کو دیکھا ہے
جو کبھی کبھی غلیظ اندھیرے جھونپڑوں میں مسکراتی ہے
میں اس حد تک غموں کا خوگر ہو گیا ہوں
اب زندگی کی مسرتیں بے سود نظر آتی ہیں
دل پتھر کا شہر لگتا ہے
جذبات سے عاری، احساس سے عاری
اے آدم گر!
کیا یہ فریب اور لفظوں کا ہیر پھیر سرشتِ آدم ہے؟

سنتو رانی

بیل گاڑی پہ بیٹھی سنتو، پستان سے اپنے ننھا لٹکائے
کچی سڑک پر دھول جگاتی، بیل گاڑی بھگاتی جائے

گہری سوچ میں ڈوبی
دور آسمانوں میں تکتی
کبھی کبھی درانتی سے سر کو کھجاتی
ہوا کو دکھڑے سناتی

''رُلدو کا بابا، میرا پریمی
نجانے کس دیس چلا گیا

جہاں سے سندیس بھی نہ آوے
یہ کیسی پرکشا ہے رادھا دیوی!
سریر کا بندھن تو ٹوٹ چکا
پر اب بھی یاد پیا کی آئے
جی رہی ہوں من میں آگ لگائے
سارا سماج مجھ کو دسشی ٹھہراوے
سنسار کو میرا پریمی نہ بھاوے
اب تو آجا سانوریا پیارے
ہو۔۔ہو۔۔۔۔۔۔۔۔!

میرے سوہنے رام پیارے
کسی من میں موہ کی اگن نہ لاگے
کسی کا پریمی پردیس نہ جاوے
جہاں سے کبھی سندیس نہ آوے‘‘

آوارگانِ خاک

کائنات خاموشی کی ردا اوڑھے محوِ عبودیت تھی
نورِ ابد نے خلقتِ نور کو جمع کیا، اور فرمایا
''میں چاکِ زماں پر ایک سفال زاد بھیجنے لگا ہوں
جسے زمامِ اختیار دوں گا''
ایوانِ فلک میں موجود نوری مخلوق نے سرِ تسلیم اٹھایا اور گویا ہوئی
یعنی وہ جو فساد و خوں ریزی کریں گے
''جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے''
نورِ ازل کا لمس پا کر مہرۂ خاک میں روح در آئی
اسمائے بابرکت پکارے گئے
نوری مخلوق سجدے میں جھک گئی
تکبر نے ''ناری'' کو لعین قرار دے کر دھتکار دیا
یہ خاک و آتش کا پہلا معرکہ تھا
جس میں خاک برتر اور آتش ابتر ٹھہری

ابتری نے خاک زاد کو بہلایا
یوں خاکِ مطلق الاختیار سرتاپا برہنہ چاکِ زمان پر آ گئی
فلک سے زمین پر آتے اختیار آدھارہ گیا
اس پر بھی دو دفترِ اعمال کندھوں پر لاد دیا
یوں آغازِ سلسلۂ آوارگانِ خاک ہوا
تنہائی اور ہجر کی ستائی یہ خاک
وصل کو ترستی ہوئی سری لنکا کے جنگلوں سے
جدے کے صحراؤں میں بھٹکتی ہوئی
مکہ کی وادیٔ غیر ذی زرعۃ میں وصل پذیر ہوئی
ابھی وصل کا نشہ بھی نا اترا تھا
''کابیل'' نے خاکِ متلون کا رنگ اپنا لیا
نسلِ خاک مصر و روم تک پہنچ گئی
موجدِ خامہ بن کر اپنی تقدیر لکھنے لگی
فلک سے دھتکاری گئی آتشیں سوچ بھی ساتھ ساتھ پلتی رہی
جوود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی صورت بہکاتی رہی
ضلالت و گمراہی کے سیلاب سے نبرد آزما ہونے کے لیے
سفینۂ نجات بنایا گیا

دہکتے تندور سے نکلنے والا سیلاب
فرعونیت کو غرق کرتا ہوا طور پہ کلیم بن گیا
یہ صدیوں کا سفر
کہیں زندگی اور کہیں قحط
کبھی من وسلویٰ کی عنائیتیں
کبھی بادِ صموم کے تھپیڑے
خاکِ متلون کی ترنگِ ابد سے نظر اندازی
بہارِ حیات کی رنگینیاں چھوڑ کر خزاں میں رنگ بھرنے کی کوشش کرنے لگے
نورِ ابد کے پیغام بر نے کہا
"اپنے گھر کے دروازوں سے ہو کر گزر و حسن کی چوکھٹوں کو گھن لگ رہا ہے"
مگر وہ اجداد کی محروم العقلی کے وارث
تمنائے عذاب کرنے لگے
یوں شہرِ سدوم کا وجود ناگوار سرائے خاک سے معدوم ہو گیا
مگر یہ نارِ بد بخت خاکِ سیاہ کو بہکاتی رہی
انسان فطرت سے کھیلتا رہا اور آواز آتی رہی
"قسم ہے زمانے کی بے شک انسان خسارے میں ہے"

میری ماں نہیں رہی

گھر میں تنہائی کا عالم ہے
دیواروں سے افسردگی چھلک رہی ہے
آنگن پر سراسیمگی طاری ہے
کمروں میں اداسی کی سیلن بڑھتی جا رہی ہے
مکیں بتوں کی طرح ساکت ہو گئے ہیں
نوائے شفیق بھی کانوں سے روٹھ گئی ہے
''بیٹا سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے''
''میرے لعل! اٹھ جا۔۔۔سورج جگانے آیا ہے''
ایک کردار کے جانے سے سب کردار بے جان ہو گئے ہیں

کہانی ادھوری رہ گئی ہے
زندگی سمندر سے بھی گہری ہے
مگر دکھ سمندر سے بھی وسیع ہیں
دکھوں سے یاد آیا۔۔۔وہ دعائیں نہیں سنائی دیتیں
''جا پتر۔۔اللہ تتی وا نہ لاوے''
''کوئی دکھ تیرے نیڑے نہ آوے''
اب دکھ بھی ہیں اور ہوائیں بھی تتی لگتی ہیں
قسمت میں اب وہ دعا نہیں رہی
افسوس۔۔۔۔اب دنیا میں ماں نہیں رہی

دریوزہ گری

پابندِ سلاسلِ قسمت، یہ خاک زاد
فگار سینے کے بل رینگتا ہوا
سڑکوں پر اپنی بے پائی گھسیٹتا ہوا
کٹے ہوئے دست و بازو لہراتا ہوا
صدائے سوال بلند کرتا ہے
جس کی غلاظت بھری حریص سوچوں کی تلوار نے
خودی کا سر قلم کر دیا ہے
سڑک کے دوسری طرف سیاہ برقعے میں لپٹی دو خشمگیں نگاہیں
ہر گزرنے والے کو سوالیہ انداز میں دیکھتی ہیں
غربت اور بے حسی کے دھول میں اٹے، برہنہ بچے

جنھوں نے بھوکی ضرورتوں کی کوکھ سے جنم لیا
لبوں پہ التجائے پیہم سجائے چیختے ہیں
''اللہ کے نام پہ دے بابا''
''اللہ جوڑی سلامت رکھے''
یہ التجائے پیہم سن کر حیرت ہوتی ہے
انسان خود ہی ستم زاد خود ہی ستمگر

یہ نسل در نسل بخشیش کے طلبگار
یہ ازلی گداگر
اقلیمِ گداگری کے شہنشاہ
جو کتنے گریباں چاک کر کے
کتنی عصمتوں کے جنازے اٹھا کر
کتنے ہنرمندوں کے ہاتھ کاٹ کر
دستِ طمع دراز کرنے پر مجبور کرتے ہیں
یہ خودی کے قاتل اس بات سے بے خبر ہیں
فقر کیا ہے اور فقیری کیا چیز ہے؟
یہ خراج کے گداگر کیا جانیں قیصری کیا ہے؟

یہ کشکول میں کھنکتے ہوئے سکوں کی جھنکار پر مست ہونے والے
کیا جانیں اتحاد، تنظیم اور یقین محکم کیا ہے؟
ان کے نزدیک سکوں کا مجموعہ ''اتحاد'' ہے
گداگری کے لیے ہاتھ کٹوانا ''یقینِ محکم'' ہے
علاقے اور وقت بانٹ کر مانگنا ''تنظیم'' ہے

سب کے طریقے مختلف ہیں میاں!
ورنہ انسان ہر روپ میں گداگر ہے
کچرے کے ڈھیر پر پڑا بچہ اپنی شناخت کا گداگر
سینے پر ڈگریوں کے تمغے سجائے گلیوں میں گھومتا جواں بھی گداگر
لباسِ رعونت پہنے سڑک پر کھڑا محافظ بھی گداگر
خدا کے نام پر مانگنے والے یہ مذہبی سوداگر بھی گداگر
یہ شاہوں کے قصیدہ گو، لفظ و معنی کے قاتل بھی گداگر
یہ بستی ہے گداگروں کی
یہاں کے شاہ و گدا سب گداگر

واپسی

وہ شخص اک مدت بعد لوٹا
جب مہجور رات کی خاموش پہنائیوں میں
پلکوں کی چلمنیں تھک کر گر چکی تھیں
آنکھوں کے منتظر دَر بند ہو چکے تھے
دل کے طاقچے میں انتظار کا چراغ بجھ چکا تھا
دھوئیں کی پرچھائیاں ڈرا رہی تھیں
امید کا چاند ڈھل چکا تھا
تنہائی بین کر رہی تھی
خواب ٹھوکریں کھا رہے تھے
ہر چیز علم بغاوت لہرا چکی تھی
لیکن اس شخص کی واپسی پر
جیسے ہر چیز میں جان در آئی ہو
محبت کی خوشبو سے گھر مہک اٹھا

دیواریں مسکرانے لگیں در چمک اٹھا
چلمنیں خوشی کے مارے جھومنے لگیں
شب کی خاموش صدائیں گنگنانے لگیں
میں ان سحر آگیں لمحات پر حیران تھا
اس عجب بات پر پریشان تھا
وہ خوشبوؤں کا قافلہ لیے پھر سے لوٹ آیا ہے؟
میرے جسم و جاں پھر سے معطر ہو گئے
وہ محبتوں کا سراب، جذبات کا گرداب
میری حسرتوں کا حساب لیے لوٹ آیا ہے
عہد و پیماں کی دھول میں اٹی کہنہ چاہتوں کا بار لیے
وفا و جفا میں بٹی حیرتوں کا فسوں لیے
سفر سے نڈھال زندگی کا جمال لیے
اچانک کہاں سے آ گیا ہے
سورج کی کرنیں چلمن کو چیرتی ہوئیں
آنکھوں کے در پہ دستک دینے لگیں، تو یاد آیا
خواب تو فقط نبیوں کے سچے ہوتے ہیں

ریزۂ ریگ

میں ریگِ رواں کا اک مضطرب ذرا
دشت کی پہنائی میں بھٹکتا ہوا
آندھیوں کی غلامی میں اڑتا ہو
جس کا وجود دوسرے ریگ ریزوں کے سوا کچھ نہیں
جس کی اندھی قسمت میں دشت کی اذیتوں کے سوا کچھ نہیں
اپنے وجود سے روز جدا ہوتا ہوا
اپنے خشک آنسو نگلتا ہوا
کبھی ریت کے بھاری ٹیلوں میں دب گیا

کبھی سطحِ ریگ پر حدت سے جل گیا

سر بریدہ، بے دست و پا لڑھکتا ہوا

وسعتِ دشت میں خود کو ڈھونڈتا ہوا

امروز سے ڈرا ہوا فردا سے ناامید

جسے اک ذرا گوشۂ تنہائی نصیب نہیں

میں صحرا نورد تشنگی کا مارا ہوا

بادِ صرصر کی سفا کیوں سے تھک چکا ہوں

زیست کی چالاکیوں سے تھک چکا ہوں

ریت کے منتشر قافلوں میں سفر کرتے تھک چکا ہوں

میری تقدیر میں لالے کا رنگ کہاں

کلی کا تبسم کہاں

نارستہ نا منزل کا نشاں

تعبیر تو کیا خواب بھی نہیں

جلتے ریگ زار میں دشت کی بیدادگری کا تنہا گواہ

مغموم صبحوں، ملول شاموں کی بھٹیوں میں تپتا ہوا

سورج کی کرنوں کے نیزے سہتا ہوا

تیز آندھیوں اور طوفانوں کا مارا ہوا

جو شاید کسی روز
مجھے جلتے ریگ زار کی وسعتوں سے اڑا کر
کسی گلزار کی نرم و گداز فضا میں لے جائیں
جہاں خوشبوؤں کے قافلے
پرندوں کی چہکار
پانیوں کے جھرنے ہوں
اس مٹی میں شامل ہو جاؤں
میری پیاس مٹ جائے
میرا بدن کسی گل لالہ کو جنم دیتے ہوئے مر جائے

کتاب اور محبت

اچانک بند دروازہ کھلا
تاریکی میں ٹھوکریں کھاتی دو آنکھیں داخل ہوئیں
تاریکی کو ہٹاتے ہوئے دو ہاتھ کھڑکی تک پہنچے
زنگ آلود کھڑکی وا ہوئی تو اندھیرا باہر بھاگنے لگا
قدم پڑتے ہی فرش نے انگڑائی لی
مدھر چاپ سنتے ہی مکڑیاں جھرجھری لے کر جاگیں
پاؤں سے لپٹتی دھول نے استقبال کیا
پراگندہ کمرے میں عجیب سراسیمگی طاری تھی
تمام الماریاں کتابوں سمیت سجدہ ریز تھیں
ایک کونے میں دیمک زدہ کتابوں کے انبار
جن کی سحر آگیں سسکیاں پیراہن سے لپٹ رہی تھیں
اوندھے منہ پڑی کتابیں آنے والے کو حیرت سے تک رہی تھیں
''یہ انسان ہے یا فرشتہ''
''کیا اب ہمیں فرشتے پڑھا کریں گے''
''یہ حقیقت ہے یا کوئی فریبِ دنیا''

''یہ کون بھولا ہوا شخص ادھر آ نکلا''

ایک ادھیڑ عمر کتاب آنکھوں سے مٹی صاف کرتے ہوئے بولی

''یقیناً کوئی کباڑی ہوگا''

ایک کونے سے ''گمان کا ممکن'' کانپتی آواز میں گویا ہوئی

''کیا۔۔۔؟ میرا ''اندھا کباڑی'' آ گیا''

''نہیں بہن ہمارے ایسے نصیب کہاں''

''یہ تو کوئی عقلی و بصری نابینا کباڑی لگتا ہے

جو شاید ہمیں فی النار کرنے چلا آیا ہے''

اوندھے منہ پڑی الماری سے ایک بوڑھی کتاب تھکی ہوئی

آواز میں بولی

''چلو کتابو! اپنے وجود کو تار تار ہوتے دیکھنے کے لیے تیار ہو جاؤ

کسی آتش دان میں جلنے کے لیے تیار ہو جاؤ

تمہارے ورق جلیں گے

تمھارا پیراہن پگھل جائے گا

تمھاری چمڑی اتار دی جائے گی''

کلیاتِ آتش نے بلند آواز میں قہقہہ لگایا

''کبھی آتش جلا تھا۔۔اب ہم جلیں گے''

فلسفہ کی ایک کتاب خوابیدہ لہجے میں گویا ہوئی
''جلنے سے ہماری بوسیدگی میں قید الفاظ تو آزاد ہو جائیں گے ناں''
اچانک ایک آواز نے سب کو خاموش کرا دیا
''جہاں پڑی ہو، چپ چاپ پڑی رہو، ورنہ ماری جاؤ گی
تمھارا جسم ادھیڑا جائے گا
گلیوں گلیوں رسوائی ہوگی''
ایک کونے سے ممتاز حسین کی ''ترقی پسند ادب'' نے نعرہ لگایا
''گویا ہم علمِ بغاوت بلند کریں گے''
''یہ ناانصافی ہے''
ایک کونے سے ''انگارے'' کی آواز چمکی
''ممکن ہے ہمیں اس سے بہتر زندان میسر آ جائے''
بڑھتے ہوئے ہاتھ کی انگلیاں الیکٹرک بورڈ تک پہنچیں
بلب میں ایک مدت سے قید روشنی نے آخری ہچکی لی
چھت سے لٹکتا زنگ خوردہ پنکھا ترنم سے جھومنے لگا
اس کے پروں سے اڑتی ہوئی گرد
معاشرے کی بے حسی پر نوحہ کناں تھی
کتابوں نے چہرے سے گرد جھاڑتے ہوئے آنکھیں کھولیں

اچانک سب پر حیرانی طاری ہوگئی، آخر یہ کون ہے؟
''باغ و بہار'' نے طلسمی سکوتِ دیرینہ کو توڑا
''کہیں بصرے کی شہزادی تو نہیں آ گئی''
''الف لیلیٰ'' انتہائی پُرمسرت انداز میں کہنے لگی
''مجھے تو ''شہرزاد'' معلوم ہوتی ہے''
''گلزارِ نسیم'' نے دونوں کی آواز کاٹی
''ارے یہ تو میری ''بدرِ منیر ہے'' ہے''
''داستانِ امیر حمزہ'' طلسماتی صدا میں گویا ہوئی
''یہ تو کوہِ قاف کی پری ہے جسے انسان نے قید کر لیا تھا
یا پھر یہ راجہ اندر کی کوئی اُپسرا ہے
اس کی جھیل جیسی نیلی شفاف آنکھوں میں جھانکو
جیسے یہ کسی لامتناہی جستجو میں محوِ سفر ہیں
روشن جبیں، یاقوت ہونٹ، رخساروں پہ سرسوں
یہ تو کوئی مصر کی دوشیزہ لگتی ہے
مگر یہ کچھ بولتی کیوں نہیں؟''
اچانک بنارسی ساڑھی میں ملبوس ''رات کی دہلیز پر'' آگے بڑھی
''بس بہن ہمیں پڑھنے والے ذرا کم گو ہوتے ہیں''

اُپسرا نے تمام کتابوں کو انتہائی غور سے دیکھا
پھر ایک کتاب کھولی جس کا نام ''محبت'' تھا
اس کے ہاتھوں کا لمس پاتے ہی ''محبت'' مہک اٹھی
لفظ کاغذ کی سفیدی پر ابھرتے چلے گئے
اس نے سوچا
یہ کتاب گاہ ہے یا لفظوں کا قبرستان
محبت کو تھپکی دی، سینے سے لگایا اور رخصت ہوئی
محبت نے اسے اپنے سحر میں گرفتار کر لیا
کبھی اس سے لفظوں کے گلاب چنتی
کبھی معانی و مفاہیم کی خوشبوئیں چراتی
کبھی مفاہیم کی آبشاروں میں نہاتی
کبھی پڑھتے پڑھتے چہرے پہ رکھ کر سو جاتی
محبت کا حرف حرف اس کے چہرے کا نور جذب کرتا
مہ و مہر کی گردش لفظوں کو نیا پیراہن دیتی
ہر رات حرف و معنی کا کھیل ہوتا
محبت کا دوسرا باب شروع ہوا
جب اسے دشت کی وسعتوں میں اکیلے چلنا پڑا

تنہائی کے پہاڑوں کو کاٹنا پڑا
سسکتی یادوں کو آنسو پلانے پڑے
صبح کے زخموں پر ضبط کا مرہم لگانا پڑا
شام کی دہلیز پر انتظار کے دیے جلانے پڑے
مہجور راتوں کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں
در و دیوار پہ چھائی اداسی کے بین سننے پڑے
تو تنہائی سے لڑتی، اندھیرے کو کاٹتی، زخموں کو کریدتی
جب نیم شبی میں آہ و فغاں کے سوا کچھ نہ رہا
نیلی روشن آنکھوں میں انتظار کے سوا کچھ نہ رہا
دلِ دریدہ میں یادوں کی غنیمت کے سوا کچھ نہ رہا
زندگی کی سب حلاوتیں کڑواہٹوں میں بدل گئیں
زندگی کی سب آوازیں، آہٹوں میں بدل گئیں
تو اس نے باب کو مکمل کیے بغیر
ایک کاغذ کا کونا موڑ کر دل الماری میں رکھ دیا
وہاں ''محبت'' کے سوا اور بھی کتابیں تھیں
جنھیں کونا موڑ کر رکھ دیا گیا تھا

ہونٹ نازپرور کے

اس نازپرور کے ہونٹ
جیسے کسی ماہر سنگ تراش نے نفاست سے تراشے ہوں
میں دن بھر جملوں کی تراش خراش میں مصروف رہتا ہوں
کاش ان تراشیدہ ہونٹوں کو لفظوں کا پیراہن دے سکوں
جن پہ سرسوں کے پھولوں کی طرح مسکراہٹ پھوٹتی ہے
تو صبح کی پو پھوٹنے کا گمان ہوتا ہے
بہار نکہتوں کا کاسہ لیے اُن کی دریوزہ گری کرتی ہے
لفظ ان کی حلاوت سے رعنائی پا کر نکلتے ہیں
مگر ان ہونٹوں پر خزاں رسیدگی
ایک بے نام سے افسردگی

ایک بے مایا سی تشنگی
جیسے پت جھڑ میں شبنم کے منتظر پژمردہ پتے
جیسے ویرانہ کسی صدا کو پکارے
دیوانہ خدا کو پکارے
مگر ایسے میں اچانک کوئی سرسراہٹ
ویرانہ کے بدن میں بجلی سی کوند جائے
وہ آمد۔۔۔وہ سرسراہٹ۔۔۔میں کیوں نہیں۔۔۔؟
کاش ایسا ہو
ہونٹ ناز پرور کے
میری آمد پہ کھلیں
میرے لیے مسکرائیں
میرے لیے گویا ہوں

چار پہیے اور گھر

یہ چار پہیوں پہ گھومنے والے
پورا گھر اٹھائے پھرتے ہیں
جو خود پہ فخر کرنے والوں کے ضمیروں کی طرح ساکت ہیں
یہ گیراج میں موجود نہ ہوں تو اُنہیں گھر، گھر نہیں لگتا
ان کے دل بھی خالی گیراج ہیں
جن میں جذبات نہیں
ان کے اجڑے مکانوں کی چھتوں کے ساتھ
نفرت کے جالے لٹکتے ہیں
جن میں یاس و حسرت کی مکڑیاں رقص کناں ہیں

بوسیدگی کا پیراہن تن پہ سجائے ان کی دیواریں فریاد کرتی ہیں
کہاں مر گئے ہم میں بسنے والے؟
کیا ہوئے ہمیں بنانے والے؟
احساس کا پلستر گرنے سے برہنہ ہوتی ہوئی دیواریں
ان کے کردار اور سوچ کی مانند
اس کے برعکس کچھ مکان ایسے ہیں
جن کی دیواروں میں گارے اور اینٹوں کی دراڑیں مسکراتی ہیں
کم مائیگی کی ماری سہمی ہوئی دیواروں کے سوراخوں میں
محبت کے دیپ جلتے ہیں
جن کی لو ہمدردی کے جذبات سے روشن ہے
ان بے چھت گھروں کے مکینوں کی آنکھوں میں
گردشِ حالات کا سورج آنکھیں نہیں ڈال سکتا
یہاں ہمت کی فصیلیں ہیں
جو بغض کی آندھی اور عداوت کے طوفان سے
ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہیں
محبت، خلوص، احساس، ہمدردی
یہ چار پہیے ہیں جن پہ یہ گاڑی رواں دواں ہے

غم کی بارشیں

اس سے پہلے کہ میری آنکھوں کو تیرے غم کی بارش بھگوتی
میری روح بھیگ چکی تھی
سانسوں میں دندانے اور جگر چھلنی تھا
تم نے مجھے اس اذیت سے آشنا کرایا
جسے ابھی میری جاں سہنے کے قابل نہ تھی
غم کی بارشیں کہاں روز ہوتی ہیں

مجھے تو بس ان گلاب کی پتیوں کی خبر تھی
جو تیری یادوں کی گور پہ ڈال آیا تھا
اگر ہو سکے خدا سے سفارش کر دینا
میں اپنا ساز و ساماں باندھے بیٹھا ہوں
تو ادھر سے کوئی ایسا قافلہ بھیج
جو مجھے اس پار لے آئے
کہیں یہ بارشیں میرا ساز و سامان بہا نہ لے جائیں
جس میں صرف تیری یادیں ہیں

گلِ امید

الفاظ کے نشتر میری سماعتوں کو چیرتے ہوئے
میرے دل میں پیوست ہو رہے تھے
یوں لگ رہا تھا جیسے
میرے احساسات کسی راہِ پُر خار سے گزر رہے ہوں
میری تھرتھراتی ہوئی زبان کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی
نجانے کتنے ہی جملے زباں کی نوک تک آتے آتے دم توڑ گئے
میں حواس باختہ یوں بیٹھا تھا
جیسے کوئی بہرا.....صداؤں سے بہت دور
خیالات نے ہر چیز کو ''لا'' کے پیمانے پر رکھ دیا تھا
میرا یقیں مجھ پہ خندہ زن تھا
گماں کے مسافر آہِ سرد کے ساتھ مجھے تک رہے تھے

پر انہیں کیا معلوم.....؟

کون جانتا تھا.....؟

یہ فصلِ بہار اتنی جلدی خزاں کی چادر اوڑھ لے گی

مگر وہ گماں کے مسافر جو اپنی عادت کے ہاتھوں مجبور ہیں

کچھ حاسد نگاہیں اُس خزاں کی مثل ہوتی ہیں

جن کے دیکھتے ہر پھول بکھر جاتا ہے

شاخیں سوکھ جاتی ہیں

پتوں پر سکوتِ جاں کنی طاری ہو جاتا ہے

یہی بس دل کا عالم تھا

جیسے کسی مرگھٹ سے راکھ اُڑ رہی ہو

اب سوختہ صبحوں اور بدنصیب راتوں کے سوا کچھ نہیں بچا

لیکن! پت جھڑ کا موسم کب سدا رہتا ہے

پھر سے آشا کی کونپلیں پھوٹیں گی

گلِ امید کو کھلنے سے کون روک سکتا ہے

حزیں حرف گر (۲)

اے عظیم کوہ ساز!

یہ دور تک پھیلا پہاڑی سلسلہ

جس کی چٹانیں صدیوں سے جلتی آگ سے روشن ہیں

جن کے اندر ظلمتوں کی تاریخ پلتی ہے

ان گنت برائیاں رگوں میں گردش کرتی ہیں

زبانوں سے رال کی صورت لاوا ٹپکتا ہے

کئی کوہ پیما بلندیوں کی بھینٹ چڑھے

کئی کوہ کن ٹکڑوں میں تقسیم ہوئے

مگر یہ انا گزیدہ

تراشی ہوئی خم دار گردنیں اٹھائے ایک دوجے کو تک رہے ہیں

جا بجا کھارے چشمے پھوٹ رہے ہیں
پھر بھی ہر سو تشنگی پھیلی ہوئی ہے
وادیاں خس و خاشاک بنتی جا رہی ہیں
بل کھاتی ہوئی سرخ ندیاں رینگ رہی ہیں
جن کی لہروں سے بوئے بنی آدم اٹھ رہی ہے
سست رو پانیوں پر اونگھتے خستہ پتوار پکار رہے ہیں
اے ناخدا! ہمیں پھر سے اپنی گرفت عطا کر
ناخدا خاموش ہے
سرخ ندیوں میں بہتے ہوئے
محرومیوں کے ڈھانچے خونی سمندر میں گرتے ہیں
اے چمن پیرائ ازل!
تیرا چمن ویران ہو چکا ہے
ہر سو خار بکھرے پڑے ہیں
پھول نکہت و رعنائی سے عاری ہیں
یہ چمن آبِ حسد سے سینچا جا رہا ہے
بہار تتلیوں کے پر نوچتی
خزاں کی آزردہ بانہوں میں جھول رہی ہے

گھبرائی ہوئی کلیاں گلوں کی شہ رگیں کاٹ رہی ہیں

اے جنگلوں کے راجا!

تیرے بنِ پیر زال میں تیرا ڈر باقی نہیں رہا

ہرنیاں بھیڑیوں کو دیکھ کر بھاگتی نہیں

نحیف بھیڑیے خونِ جواں سے پیاس بجھا رہے ہیں

بوڑھی گدھیں کبوتروں کے گرم پروں میں مدہوش ہیں

اشتہائے بدن روح کی بھوک پر غالب آ گئی ہے

ایک بھیڑیا دوسرے بھیڑیے کا ماس نوچ رہا ہے

ایک آہو دوسرے آہو کی آغوش میں مست ہے

بیزار چھپکلیاں

سادہ لوح پتنگے نگلتی چھپکلیاں
جگہ جگہ زہر اگلتی ہوئی
سیاہ رات میں بے خبر رینگتی چلی جاتی ہیں
خود کو آزاد سمجھ رہی ہیں
شب کی سولی پہ لٹکتی یہ بیزار مخلوق
اپنے جسموں کی نمائش سے بے پروا
مکاری کے نقاب پہنے
آنکھوں میں آنچلوں کے رنگ لہراتے ہوئے
جنھیں محافظ سمجھ کر بانہوں میں جھول رہی ہیں
انھیں خبر نہیں
وہ ہوس کے زہریلے سانپ ہیں
جوان کے حسن کا سارا خزانہ ایک ہی سانس میں نگل جائیں گے
ان کی سادگی نوچ لیں گے
زندگی نوچ لیں گے

جنم دن

میں یہ بات کسے بتاؤں؟
''آج جنم دن ہے میرا''
یعنی! یہ بتاؤں
آج بھی تنہا ہوں میں

کشمکش

میں کل بہت اداس تھا
زندگی کو پیارا کر کے
تڑپتی یادوں میں بٹی محرومیوں کو دفن کیا
محرومیوں کی دھول میں اٹی
خواہشوں کو زندہ درگور کر دیا
میں آج بہت خوش ہوں
موت سے کنارہ کر کے

ہوٹل میں ایک شام

جونہی نرم ہوا ہوٹل کے پردوں سے ٹکرائی
ایک لذت بھری صدا نے میرے کانوں کی لوؤں کو چوما
''دال، بھنڈی، ٹنڈے، آلو قیمہ، چکن کڑاہی''
''جی صاحب۔۔۔۔!''
''کیا کھائیں گے آپ''
میں نے دال کا کہا اور باہر دیکھنے لگا
تندور پہ ہنگامہ آرائی کا منظر
جیسے کسی محاذ پر شورِ قیامت
نان بائی لبوں پہ مسکراہٹ سجائے
آنکھیں دھوئیں کے مرغولوں میں بند کیے
مست و بے خود
اپنی دھن میں روٹیاں لگا رہا ہے
کبھی کبھی محاذ آراؤں کو دیکھتا ہے، مسکراتا ہے

''بھیا۔۔۔اب میری باری ہے''

ہال میں اردگرد کی میزوں پر بیٹھے

مسافرت، مزدوری اور بیزاری کے مارے ہوئے

ایک دوسرے سے دشتِ معیشت کا احوال بیان کرتے ہوئے

''یار اس دفعہ بل بہت زیادہ آئے ہیں''

''ہاں یار مہنگائی کی حد ہوگئی ہے''

''دو وقت کام کر کے بھی دو وقت کی روٹی نہیں پوری ہوتی''

برتنوں کی کھنکھناہٹ اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ

ان سب میں ابھرتی ہوئی آواز

''ایک دال فرائی۔۔۔ہاف چھوٹا گوشت''

''اوئے چھوٹے۔۔ایک کپ گرما گرم چائے''

میں آوازوں کے ہجوم کو دیکھتا رہا

میری طرف نہ دال آئی نہ روٹی

نظم سے اپنی بھوک مٹائی اور چل دیا

کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی

''بھیا۔۔! بھیا۔۔! آپ کی دال فرائی''

ہم کیسے جی رہے ہیں؟

ہم زندگی سے بھاگے ہوئے
نجانے کدھر جا رہے ہیں
ہمیں کچھ خبر نہیں ہے
اپنی محرومیوں میں رنگ بھرنے کی خاطر
سفید لمحوں میں جی رہے ہیں
موت بھی ہم پر ترس کھاتی ہے
ہم بھی کیا جی رہے ہیں؟
آنکھوں کو بند کیے
تشنہ ہونٹوں کو سیے ہوئے

مگر کیا کیجیے
آنکھوں کی خستہ چلمن سے خواہشیں جھانک لیتی ہیں
برہنہ حسرتیں رینگتی ہوئیں لبوں تک آ پہنچتی ہیں
دل بھی ایک ایسے پیڑ کی مانند ہے
جس کی شاخوں پر امید کے پھول کھلتے ہیں
مگر امید بھی صرف ان کے لیے جن کے غلّے بھرے ہیں
آنگن سجے ہیں
مگر ہم ضرورتوں کو چبانے والے
مجبوریاں ہمارے نیم برہنہ جسم و جاں کو نوچتی ہیں
دشت معاش میں بھٹکتے ہوئے
ضرورتوں کی سولی پر لٹکتے ہوئے
چہروں کی جھریاں غربت کے غازے سے چھپاتے ہوئے
سارا دن بے کار مصروفیت میں صرف کر کے
جینے کے بہانے ڈھونڈتے، خالی ہاتھ لوٹ آتے ہیں
انہی گھروں میں
جن کی برہنہ دیواریں بوسیدگی اوڑھے ہماری منتظر ہوتی ہیں
چھتوں کی کہنگی ہمارا استقبال کرتی ہے

روزنوں کے جالے سلامی دیتے ہیں
دیمک زدہ کھڑکیاں مسکراتی ہیں
گلدانوں میں پڑے مرجھائے ہوئے پھول
سیاہ طاقچوں میں دم توڑتی ہوئی چراغوں کی لو
نحیف ونزار زندگی سے لڑائی لڑتے ہوئے بچے
جن کے چہروں پر محرومی کے ڈیرے
جن سے آباد سب رین بسیرے
شہروں کے شہر بسا دیے
عمارتوں کے جنگل اگا دیے
مگر خود سراسیمہ تنہائی کے اسیر
اپنے آپ سے لڑ رہے ہیں
جیتے جی مر رہے ہیں

جلتا ضبط

آج بچھڑتے وقت وہ ستم کیش
مجھ سے بار بار گلے مل رہا تھا
اس کی آنکھیں دھواں دھواں تھیں
شاید میری طرح اس کا ضبط بھی جل رہا تھا

انتظار

ماں۔۔۔!تم نے کہا تھا
بابا آسماں پر سیر کو گئے ہیں
کل آئیں گے
میں اس کل ہی کے انتظار میں بسمل ہو گیا ہوں
اے ماں! تو بھی کہہ بابا سے
''اب لوٹ بھی آئیں''
ان کی انگلی تھامے بنا
اب چلنا مشکل ہو گیا ہے

ہم ہر لمحہ فسوں میں ہیں

ہم نجانے کس فسوں میں ہیں
خود سے بے خبر، منتشر منتشر
شب و روز کے فریب میں
سایۂ آسیب میں
ہم اس فریب کے فسوں میں ہیں
جس میں زندگی کی حلاوتیں، کروا ہٹوں میں بدل گئیں
مسکراہٹیں، قہقہے، محفلیں، سب آہٹوں میں بدل گئیں
کیا ان دروازوں کو گرا نہ دیں؟
اب کوئی دستک نہیں دیتا
کیا ان مکانوں کو ڈھا نہ دیں؟
جہاں مکڑیاں مکیں ہیں

جالے محوِ رقص ہیں
جالے جنھوں نے دل و دماغ جکڑے ہوئے ہیں
ہم اس عنکبوت کے فسوں میں ہیں
یہاں شناساؤں کا ذکر کیا
یہ اجنبیوں کو بھی نگل گئی
عجب سی بے دلی ہے۔۔اک مہیب خامشی ہے
ہم خامشی کے فسوں میں ہیں
گفتار کا تو ذکر کیا یہ سرگوشیاں بھی نگل گئی
کوئی اسرافیل کو آواز دے
کوئی عزرائیل کو بلائے
اب معنیٔ زیست کا کسی کو پتہ نہیں
یاں ہر نفس اک جنوں میں ہے
ان کا یہ جنوں بھی کچھ نہیں
بس وقت کے ساتھ ایک دوڑ ہے
وقت سے آگے کوئی نکلا نہیں
ہر کوئی اپنے فسوں میں مبتلا ہے

قیاس آرائیاں

میں یہ سمجھا تھا
وہ خود میرے پاس آئے گا
اس خوش فہمی نے اسے گنوا دیا
اب میرا ہر لمحہ
اس غلط فہمی میں گزرتا ہے
میں نے اپنے دل سے اس کو مٹا دیا

تسلی

اس نے ایک دن کہا تھا
''میں خود ہی کال کروں گا''
ہم نے اس دن سے موبائل سائیلنٹ پر نہیں لگایا
اس کے نمبر پر ہر روز نام بدلتے رہے
ہم نے دل کو کیسے کیسے نہ سمجھایا
پر اس پیماں شکن کا فون نہ آیا

وقت گزاری

دن کی روشنی تو فقط اک بہانہ ہے
میں تو اندھیرے میں بھی مسکراتا ہوں
دن بھر فرقت کے جھولے میں بیٹھے
یادوں کا جھولا جھولتا ہوں
تنہائی کے ساتھ جھومتا ہوں
پھر رات دیر تک
یادوں کو لوری سناتا ہوں
اپنا دل جلا کر محبت کی بجھتی ہوئی شمع کی لَو کو سہارا دیتا ہوں

حزیں حرف گر (۳)

اے آدم گر!
میں تیرے وصل کی خواہش کا مارا ہوا
ازل سے کاندھوں پہ روشنی کا بوجھ اٹھائے
جو کبھی میرے سامنے جھکی تھی
اب میرے ہر عمل کی گواہ ہے
میں سوچتا ہوں
وصل کیسے ممکن ہو
ہمارے درمیان ایک آتشیں دیوار ہے
وہ آگ جو مانندِ خوں مجھ میں رواں ہے
لمحہ بھر بھی اپنے کارِ پیہم سے بے خبر نہیں
جس کے سائے میں خواہشیں بھڑک رہی ہیں
یہ روشنی یہ آگ دراصل واہمے ہی تو ہیں
میرے ہونے سے یہ واہمے تصویر بنتے ہیں
وہ تصویر جو ہر لمحہ بدل رہی ہے

اے رہنمائے ابد!
تو بھی آدم زاد کو الجھائے رکھتا ہے
محبت کے لالچ میں، رشتوں کی بھول بھلیوں میں
سفر کی الجھنوں اور منزل کی ہوس میں
مگر جب حسد اور نفاق کی آندھیاں چلتی ہیں
رشتے اپنی لگائی آگ میں جھلستے ہیں
بچھتاوے کی راکھ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا
یہ آدم زاد حقیقتوں کے سب آئینہ توڑ چکا ہے
خود فریبی کے عوارض میں مبتلا
حقیقت سے نظریں چراتا ہوا
سفرِ ابد پر گامزن
اے آدم ساز!
اب ایسی مٹی سے کوئی آدم تخلیق کر
جس میں خواہشوں کی بو نہ ہو
حسد کی آگ نہ ہو
فریب کی باس نہ ہو

نارسائی

ایک مدت گزر گئی
گھر والوں سے کوئی فرمائش نہیں کی
ایک عرصے سے آئینہ نہیں دیکھا
دیکھوں بھی کیا؟
خود کا چہرہ تو یاد نہیں
مجھ پر کونسا رنگ اچھا لگتا ہے؟
معلوم نہیں
میں بال بناؤں تو کیسا لگتا ہوں؟
میں مسکراؤں تو کیسا لگتا ہوں؟
میرا آئینہ بھی میرے اندر کی طرح لکیروں سے اٹا ہوا ہے
میں ایسے لمحوں میں جیتا ہوں

جو میرے بس میں نہیں رہے
خوشبوؤں سے گھبراتا ہوں
رنگوں سے ڈرتا ہوں
دکھوں سے کھیلتا ہوں
ماضی کے خوابوں سے ڈرتا، آنکھیں بند نہیں کرتا
چار سو پھیلے اندھیرے میں روشنی تلاشتا ہوں
امروز و فردا کی الجھنوں میں رونے لگتا ہوں
یادوں کے در پہ دستک دیتا ہوں
مگر دروازہ نہیں کھلتا
آنکھوں کے ساحلوں پہ اترتے ہوئے، غموں کے سفینے
میرے ضبط کے ساحل کو ڈبو دیتے ہیں
میں رنجور صبح سے نکل کر، حزیں دوپہر سے رینگتا ہوا
شام کی آزردہ پگڈنڈیوں پر جا پہنچتا ہوں
جہاں محرومیوں کا اندھیرا میرا منتظر ہے
وہی ''لا'' کی لامتناہی رات
یقین سے کوسوں دور، گماں کے جنگلوں میں بھٹکتا ہوا
اپنی ہستی کو ڈھونڈتا ہوں

عیدی

جب لوگ آسمان کی وسعتوں میں
ایک خم دار دھندلی سی لکیر تلاش کر رہے تھے
جو سب کے لیے باعثِ مسرت تھی
مگر کسے خبر تھی
وہ شام میرے لیے غموں کے طوفان لانے والی ہے
اس لکیر کو دیکھتے ہوئے
میرے تصور میں بھی ایک نقطہ سا پھیلنے لگا
جو ایک مانوس صورت کا روپ دھار رہا تھا
چند قیمتی اذیت دہ لمحات میں ڈھلتی صورت

آخر یہ کس کی صورت ہے؟
اُس شخص کی جو مجھے ادھورا چھوڑ گیا؟
اُس مصور کی طرح
جو منزل کو چھونے کی لگن میں
اپنی تخلیق ادھوری چھوڑ کر چل دے
میں ایک نامکمل تصویر ہوں
میرا مصور کہاں چلا گیا؟
جو مجھے نامکمل چھوڑ گیا، میرے کھلونے توڑ گیا
یہ کھلونے کب مزدوری کے اوزار بن گئے پتا نہیں چلا
میرے خیالات کی دنیا کیوں بکھیر دی گئی
شامِ الم شبِ ملول میں کیوں بدلتی چلی گئی
میں آزردگی کے عالم میں سرِ فلک ابھرتی ہوئی خمیدہ لکیر کو دیکھ رہا ہوں
مجھے بھی اس شخص کو عیدی بھیجنی ہے
سنا ہے اس پار بادِ صبا کے قافلے جاتے ہیں
محرومیوں کی ٹوکری میں دریدہ صبحوں کی کلیاں
محزون شاموں کی تنہا کونپلیں
رنجور راتوں کے سرمئی خواب

غمزدہ لمحوں کے زردانے

یادوں کے تازہ گلاب سجائے منتظر ہوں

اے بادِ صبا میری عیدی اس تک پہنچا دینا

اسے یہ بھی بتا دینا

اب میں کسی سے ضد نہیں کرتا

اب میں کھلونے ٹوٹنے پر روتا نہیں ہوں

اب میں خود کھلونا ہو گیا ہوں

میرے آنسو پلکوں کی دیواروں کے سائے میں بیٹھے رہتے ہیں

میرا ضبط انھیں باہر نہیں آنے دیتا

آتم کتھا

وہ مجھ سے اس وقت بچھڑا تھا
جب آنکھوں کے سیپ خوابوں کے موتیوں کو ترستے تھے
جب جسم و جاں پر رنگِ بہار نہیں چڑھا تھا
جب روح احساسِ کرب سے نا آشنا تھی
زندگی کی حقیقت کا ادراک نہیں تھا
کوئی دوست تھا نہ دشمن
اب میرے پاس سب کچھ ہے
یادیں، محرومیاں، اذیتیں
کیسے انمول کھلونے ہیں
مگر افسوس بے فکری کی دولت چھن گئی
میرا تو اب بھی کوئی دوست نہیں
آسودگی اور نا آسودگی خدا کی کیسی دین ہے
خودکشی بھی بیزاری میں ڈھلتی جا رہی ہے
مجھے ایامِ گزشتہ میں سے کچھ بھی یاد نہیں

جز صداؤں کے اس سیلاب کے
جو نیم کے سائے سے یکبارگی بہہ نکلا
میری ہر خوشی بہا لے گیا
تب سے دل کے در و دیوار خستہ پڑے ہیں
اب بھی اسی دیوارِ گریہ پر
اذیت کے فریموں میں لمحات کی چند ٹوٹی پھوٹی تصویریں سجی ہیں
میری آنکھوں کی تہوں میں خواب انگڑائیاں لینے لگے ہیں
سنا ہے بچھڑے لوگ خواب میں ملنے آتے ہیں
میں اسی امید پر ہر رات
آنکھوں کے گھائل در بند کر لیتا ہوں
شاید وہ ازل کا مسافر
کبھی راستہ بھول کر میرے پاس آ نکلے
مگر ایسا کبھی نہ ہوا
میں رات کی طویل پگڈنڈی پر
پلکوں پہ انتظار کے دیے جلائے منتظر ہوں
سیاہ آسمان میں سرمئی بادل تیر رہے ہیں
جن سے آج تک کوئی ایسی بوند نہ ٹپکی

جس نے خامشی کی کوکھ میں آواز بن کر جنم لیا ہو
کسی برگِ گل کو رعنائی بخشی ہو
ہر طرف خارِ پریشاں گریہ زاری کر رہے ہیں
اچانک سورج کی کرنیں پلکوں کا در کھٹکھٹاتی ہیں
میں خود کو دن کے دشت میں پڑا پاتا ہوں
جس میں قدم قدم پر سراب ہیں
سارا دن اس جلتے دشت میں چلتا ہوں
یادوں کی کرنیں تیروں کی طرح برستی ہیں
شام کی مہجور چوکھٹ پر پہنچ جاتا ہوں
جہاں اداسی کا دھواں مجھ میں در آتا ہے
میں چار و نا چار آنکھوں کے شکستہ در بند کر کے
رات کی طویل پگڈنڈی پر رینگنے لگتا ہوں
نیم کا نیم برہنہ پیڑ
سراسیمگی کے عالم میں مجھے حیرت سے تکتا ہے
یہیں سے آخری بار شورِ حزیں اٹھا تھا، جس نے
نیم کی کراہٹ رگ و پے میں اتار دی ہے
اور لبوں پہ مسکراہٹ اُگ آئی ہے

کاروانِ زنبور

یہ کاروانِ زنبور ازل سے محوِ سفر ہے
اس عظیم جدوجہد پر طویل مسافتیں بھی حیران ہیں
جس نے اپنے لہو رنگ پرچموں سے
نیلے آسماں کو چرخِ احمر میں بدل ڈالا
سرد راتوں میں خونیں انقلاب کے چراغ جلائے
یہ کاروانِ زنبور
کاندھوں پر اہرامِ مصر اٹھائے
دشت کی وسعتیں ناپتا
کوہساروں کی بلندیاں کاٹتا

دریاؤں کے دل چیرتا ہوا
رگوں میں بہتے سرخ خون کا لاوا لیے
کوہ قاف کے برفیلے راستے پگھلاتا
صحارا کی چلچلاتی دھوپ چاٹتا
دیوارِ چین روندتا
شاہراہِ ریشم پہ پھسلتا ہوا مہکتے گلزاروں کی وادی میں اترتا ہے
یہ کاروانِ زنبور ستارۂ صبح کے ساتھ طلوع ہوتا ہے
دشتِ معیشت میں گھومتا ہوا
تھک ہار کر رات کی دہلیز پہ آ گرتا ہے
وادیٔ گل میں جب ایامِ عشرت آتے ہیں
خانۂ زنبور سے قطراتِ انگبیں ٹپکتے ہیں
نتھنوں میں خراج کا دھواں داخل ہوتا ہے
خوابیدہ زنبور تڑپتے ہوئے زمین پر گرتے ہیں
وحشی درندے زنبوروں کا جسم نوچتے
قطراتِ انگبیں چرانے پہنچ جاتے ہیں
نوکیلے پنجوں سے نازک گھروندوں کو پامال کرتے ہوئے
یہ درندے لوٹ جاتے ہیں

یہ ایک دیرینہ تسلسل ہے
شاہی ٹکڑوں پہ پلتی ہوئی ضعیف تاریخ گواہ ہے
جو ہمیشہ سے مغرب کے سایہ آسیب میں ہے
ایشیا کے حریص و ناتواں اذہان
افرنگی دیوں کے سحر میں جکڑے ہوئے ہیں
یہ قانونِ شہرِ یزداں نہیں
جو پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالے
وہ جرعۂ آب کو بھی ترستا رہے
جن سے سفرۂ طعام کی سب لذتیں ہیں
وہ پارچۂ نانِ جویں کو تکتے رہیں
نجانے یعسوب الوقت کیوں بے خبر ہے
ان اہرمنی بھڑوں کی ڈار سے
جو اعلیٰ مسندوں پر ڈنک نکالے انتظار میں ہیں
کب اِن کا ڈنک کارگر ہو
تا کہ ایامِ عشرت گزر سکیں
حریص حشرات اکثر ان کا رزق بنتے ہیں
مگر ایامِ زوال میں

یہ کالے دھن سے پلے ہوئے اہرمن
ٹھٹھرتے ہوئے توند کے بل زمین پر گرتے ہیں
کچھ مکڑیوں کے شیش محل میں جا گرتے ہیں
بھوک کے مارے نحیف حشرات
ان کی میتیں اٹھائے دھوم مچاتے ہیں
مگر اس بات سے بے خبر
کہ بھڑوں کی نئی نسل انھیں ڈسنے کو تیار بیٹھی ہے

مے کدہ

مے کدہ ویراں پڑا ہے
جام و سبو آشفتگی اوڑھے مدہوش پڑے ہیں
کوئی آہٹ نہیں، کوئی چاپ نہیں
شمع چپ چاپ پگھل رہی ہے
ساقی چلمن کے پیچھے لفظِ ''کن'' الاپ رہا ہے
رند ''فیکون'' کہتے ہوئے اس کی طرف لپکتے ہیں
وہ موجود ہے سب کی سنتا ہے
مگر دکھائی کسی کو نہیں دیتا
جو کہتا ہے سنائی کسی کو نہیں دیتا
کوئی خمِ بادۂ احمریں اٹھائے جھوم رہا ہے

کوئی آنکھوں کے خالی کاسے لیے قطرۂ بادۂ ناب کا منتظر ہے
کوئی بادۂ آتشیں سے سیر ہے
تو کوئی نکہتِ مے سے مخمور
مگر یہ مئے دو آتشہ کوثر سے ہوئے
زیست کے خمار سے بھری آنکھوں والے
یہ ازل سے فریبِ تشنہ لبی کے مارے ہوئے
امروز سے گھبرائے ہوئے، فردا سے بے خبر
جنہیں مشربِ رندی کا ذوق ہی نہیں
یہ شرابِ ''الست'' بھول چکے ہیں
ان کے اذہان وقلوب سے
''قالوبلیٰ'' کا نشہ اتر چکا ہے
کچھ ناصحینِ مشفق اس مے کدے سے کوچ کر گئے
مگر ہم رندِ لم یزل
چشمِ ساقی کی عنایت پہ جی رہے ہیں
اے ساقیِ ازل! اے مہرباں!
''چند قطرے بادۂ نشاط کے
ہمارے جامِ شکستہ میں در دِ رفتگاں کے سوا کچھ نہیں''

یہ پیار کیا ہوتا ہے.....؟

دل کے آنگن میں یادوں کے پیڑ تلے
اک تڑپ سر بہ زانو اداس بیٹھی تھی
در و دیوار اسے مبارک باد دے رہے تھے
اس کی کوکھ میں ایک ننھا سا قطرہ ہے
جواب ایک قلزم بنتا جا رہا ہے
یادوں کی تیز ہوا چلتی ہے
تو اس قلزم میں اضطراب پیدا ہوتا ہے
یادیں سب پردے چیرتے ہوئے اسیری سے نکل آتی ہیں
قلزم خود ہی اپنا راستہ بنا لیتا ہے
اور ضبط کی فصیلوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے
جیسے ہی اس قلزم کا پہلا قطرہ چشمِ حزیں سے ٹپکتا ہے
تو ایک صدائے بلند فضا کے سینے کو چیرتی ہے
یہ پیار کیا ہوتا ہے.....؟

تاشی تصویر گر

میں اذیت ناک لمحوں کی گود میں سر رکھے رو رہا ہوں
بچپن کی یادوں کے کچے رنگ
تصویر کے کینوس پر پکے رنگوں میں ڈھلتے جا رہے ہیں
یہ رنگ میرا قیمتی اثاثہ ہیں
دھنک تتلیوں کے دیس سے یہ رنگ چرانے آتی ہے
یہ سب میرے تصور کی پیداوار ہیں
کسی تصویر میں امن کہلاتے ہیں
کسی میں محبت کے دکھ بن جاتے ہیں
چند تصویریں مجھے آزردہ کر دیتی ہیں

جن کے رنگ کچے ہیں
رخساروں پر جھریاں نمایاں ہیں
کبھی کبھی دل کرتا ہے
ان کو جمع کر کے یادوں کے آتش دان میں جھونک دوں
اور پھر نئے اذیت پاروں کی نمائش لگاؤں
مگر یہ دکھ اپنی جگہ سلامت رہتا ہے
میری اذیت تصویر کیسے ہو سکتی ہے
کوئی صاحبِ نظر ہو
جو ان تصویروں سے باتیں کرنے کا ہنر جانتا ہو
میرے رنگوں سے مکالمہ کرے
میری تصویروں کے دکھ بانٹے
مگر میں تو خود بھی ان تصویروں کی مانند ہوں
جو بے رنگ کینوس پر ساکت کھڑی ہیں
میں ان گنت صورتوں کا خالق، اپنی پہچان سے نا آشنا
کوئی تو ہو جو مجھے تصویر کرے
مجھ میں زندگی کے رنگ بھرے
نمائش میں ہی سہی لوگ مجھ سے باتیں کریں

میں اپنی بے جان مخلوق کا دیوتا
ان تصویروں سے ہم کلام ہوتا ہوں
جو میری کم مائیگی پر آنسو بہاتی ہیں
سارا کینوس رنگین آنسوؤں سے بھر جاتا ہے
میری تخلیق پر انگلی اٹھانے والے یہ ذہنی مفلوج
روشن چہروں والے بے بصر
شوخ لباسوں والے پتھر دل
احساس سے عاری دولت گر
ریا اور مکاری کے کچے رنگوں سے چمکتی مخلوق
میرے پکے رنگوں کی اہمیت کیا سمجھے گی
یہ نو بلوغیت کے دائرے میں قید عفونت زدہ تنگ ذہن
ان رنگوں کی وسعت کا اندازہ کیا کریں گے
جن کی خوشبو تک پہنچتے زندگی کا سورج ڈھل جاتا ہے

نجانے کس لیے

سحرِ حزیں، مسائے الم، شبِ ملُول، دلِ غمگیں
حسرتِ مسکیں، اداس راہیں، کھوئی کھوئی نگاہیں
بنا ہم سفر، نگر نگر در بدر
سانسیں بے قرار، پا فگار
بے رنگ آسماں، دھواں ہی دھواں
آرزوؤں کے جال میں
حسرتِ وصال میں، گم کسی خیال میں، کسی کے ملال میں
بھیگی ہے آستیں، یا رم نہیں قریں
ذاتی ملکیت میں کچھ آنسو، اس کا وجود نہیں جس کی جستجو
دلِ منتظر اداس ہے، کوئی آس نہیں پھر بھی آس ہے

بے کیف سی زندگی، لبوں پہ آثارِ تشنگی
چہرے سے چھلکتی آشفتگی
عجب سے بے دلی، نہ غم ہے نہ خوشی
ہونٹوں پہ بے نام سی مسکراہٹ سجائے
بس ہیں اپنے کام چلائے
آنکھوں میں بھٹکتے ہوئے خواب
محرومیوں کے مہکتے ہوئے گلاب
رباب غم پہ رقص کرتی حیات
آنکھوں میں دم توڑتی رات
ہر سو ہیں مہیب سائے، جو اپنے تھے ہوئے پرائے
اذیتوں کی ردا اوڑھے ہوئے
مصیبتوں سے رشتہ جوڑے ہوئے
یادوں کی نہر کے کنارے
جذبات کے ٹوٹتے ستارے
برائے نام محبتیں، رسمی سی الفتیں
محبت ہوئی بے سرور، وفا کے ہاتھوں مجبور
خواہشوں کا ڈھلتا آفتاب، زیست ہوئی اِک سراب

بجھے بجھے چراغ، خالی خالی ایاغ، سینے میں جلتے داغ
گنگ صدائیں، گرم ہوائیں
قسمت کے انوکھے راگ، ضرورتوں کے کالے ناگ
دل دکھاتی بہاریں، آنکھوں سے گرتی آبشاریں
جذبات بھی ٹھہرے ٹھہرے، الفاظ بھی تھکے تھکے
نفرت کی پھوٹتی کرن، چاہت کا جلتا پیرہن
زندگی کی کچی راہ پہ اڑتی غبار میں
میں بھی کچھ غبار اڑا رہا ہوں نجانے کس لیے؟

دروازہ

دہلیز پہ بیٹھی ایک بڑھیا چہرے کی جھریاں سہلا رہی تھی
اس کی دھندلائی آنکھیں بیتے دنوں پہ نوحہ کناں تھیں
جیسے یادوں کی آگ آنسوؤں سے بجھا رہی ہو
نحیف ہاتھوں میں وقت کا تحفہ تھامے
ڈھلکتے آنچل سے بے خبر نجانے کن دنیاؤں میں گم تھی
اپنی صدا سے دور کئی صداؤں میں گم
دھندلی آنکھوں سے ماضی میں جھانک رہی تھی
وہ دل کش چہرے اور حسین منظر
کچی دیواریں اور کھلے در
روشن طاقچے اور جھلملاتی چلمنیں

بچوں کی اٹھکیلیوں سے مہکتے آنگن
چاندنی میں نہائے مسکراتے چہرے
پیپل کے پتوں کی سرسراہٹ اور جھولوں کی آوازیں
کیاریوں میں پھولوں پر بیٹھی مکھیوں کی بھنبھناہٹ
کچی دیوار کے طاقچے میں بیٹھی ایک گڑیا
بابا کے شانوں پہ بیٹھی ہوا میں جھومتی ہوئی ایک بچی
بڑھیا کو دیکھ کر سوال کرتی ہے
''یہ گڑیا طاقچے میں اکیلی کیوں ہے؟
اس کا گڈا، اس کا سانوریا کہاں گیا؟''
بڑھیا داہنے ہاتھ سے جھریاں صاف کرتے ہوئے کہتی ہے
''بٹیا۔۔۔! زندگی بچھڑنے کا نام ہے
کبھی گڈا پہلے بچھڑ جاتا ہے، کبھی گڑیا
یہ میرے سفید ژولیدہ بالوں کو دیکھتی ہو
نجانے کتنے پھول ان میں سجنے کو بے تاب رہتے تھے
اب حالات کی سیاہ چادر میں دبکے رہتے ہیں
یہ کلائیاں دیکھو جن پہ لوہے کے کنگن رہ گئے ہیں
کبھی پھولوں کے گجرے ہوتے تھے

کانچ کی چوڑیاں بھی ان کو بار لگتی تھیں
یہ خمیدہ کمر دیکھ رہی ہو
کبھی شاعر اس کے قصیدے بیان کرتے تھے
انسان بھی کتنا بے بس پجاری ہے
تمام عمر خواہشوں کو پوجتا ہے
یہ مٹی کا پتلا جسے اذیتوں بھرے ساٹھ ستر برس دے کر
اوندھے منہ زمین پر گرا دیا گیا
جن میں سے آدھے خواہشیں نگل جاتی ہیں
کچھ بھوکے بھیڑیے بھی ہیں جو خواہشوں کا بدن نوچ کھاتے ہیں
بٹیا۔۔! یہاں ہر نفس گم ہے
کوئی فضاؤں میں کوئی سزاؤں میں
کوئی وفاؤں میں، کوئی جفاؤں میں
تم سے اگر ہو سکے تو دروازے کے اُس پار ہی رہنا
اِس پار تو اذیتوں کے سوا کچھ نہیں
اس طرف درد ہیں، چھبن ہے
صحرا ہے، دہشت ہے، وحشت ہے‘‘

آخر کیا ہے زندگی؟

زندگی پر یہ بے لاگ تبصرے
وقت کے ضیاع کے سوا کچھ نہیں
زندگی کا سراغ کسے ملا ہے
ہر کسی کو زندگی سے گلہ ہے
یہ کیوں اور کس لیے ملی؟
مورِ ناتواں کے سکڑتے پیٹ کی صدا ہے زندگی؟
بیلوں کی بھوک سے نکلی پسلیوں کی نوا ہے زندگی؟
سنگ و خشت اٹھائے مزدوروں کی ندا ہے زندگی؟

تخت پہ بیٹھے شیروں کی عیش کا نام ہے زندگی؟
کسی ماہر شکاری کا لگایا ہوا دام ہے زندگی؟
زندگی تو ایک خونی بھیڑیا ہے
جس کے منہ میں کئی قسم کے دانت ہیں
سچ، جھوٹ، ہوس، مکر، فریب وغیرہ کے دانت
مگر یہ انسان آگہی کے دام میں آنے والا نہیں
ایک دانا چرواہا بڑی حکمت کے ساتھ
وقت کا عصا تھامے تمام غرض کے ماروں کو ہانک رہا ہے

میں اور تو

ہماری زندگی ہے کچھ یوں منتشر
جیسے دو متوازی خطوط کا سفر
نہ ابتدا میں لچک
نہ انتہا پہ خم
بس محوِ سفر ہیں
نہ ابتدائے سفر کا جنوں
نہ وصال منزل کی لذت
فقط اک خلا ہے
جو درمیاں پڑا اونگھ رہا ہے
یہ ''تُو''، ''میں'' کے دو خطوط
نہ کبھی دکھ بن سکے
نہ کبھی سکھ بن سکے

تنہائی

ہائے! یہ جسم و جاں کو کاٹتی ہوئی پر اسرار خاموشی
وہ راتوں کو جگانے والے کیا ہوئے
آنکھوں کی پتلیوں میں نیند چبھ رہی ہے
وہ داستان سنانے والے کیا ہوئے
ہر لمحہ تنہائی ڈسے جا رہی ہے
وہ عہد و پیماں نبھانے والے کیا ہوئے

قید

میں سانس تو لے رہا ہوں
مگر کسی کی اجارہ داری میں
یعنی! پر پھیلائے اڑ تو رہا ہوں
مگر گھر کی چار دیوری میں

بدصورت غربت

یہ کیسی تنہائی ہے
میں یادوں کے سیلاب میں بہتا جا رہا ہوں
میرے ایک ہاتھ میں خواہش اور دوسرے میں محرومیاں ہیں
پاؤں میں غربت کی زنجیریں ہیں
گلے میں ضرورتوں کا طوق ہے
مجبوریاں سیاہ حلقے بن کر نکھوں کے گرد لپٹی ہیں
پلکوں پہ جمی اداسی
قطرہ قطرہ پگھلتی کھردرے رخساروں پہ گرتی ہے
میرے نیلے ہونٹ جن پہ دوپہر کی جلتی خشک دڑاڑیں ہیں

آبِ مودت کو ترستے ہیں
اذیت کی بھوک سے ابھری پسلیاں پھڑ پھڑاتی ہیں
خواہشیں اڑنے کو پر تولتی ہیں
مگر زندان کی سلاخوں سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرتی ہیں
یہ غربت اور بدصورتی ایک سے کیوں ہیں؟
ہر بار میں ہی مرتا ہوں
یہ کیوں نہیں مرتے؟
کیا اس سیاہ سماج میں ٹھکرائے جانے کے لیے
غربت اور بدصورتی ہی کافی ہے

دیواریں

میری پہلی صدا شکستہ دیوار سے ٹکرا کر
جانے کن سماعتوں کی نذر ہو گئی
میری پہلی نگاہ دیوارِ انا پہ پڑی
جس نے میری بینائی نوچ لی
میرے لیے کسی دیوار کے پاس سایہ نہیں
نہ کسی پر میٹھے انگوروں کی بیل ہے
جن کی مٹھاس کو میرے ہونٹ ترستے ہیں
اگر کوئی دیوار میری نگاہ کا برہم رکھ پاتی
میرے ہونٹوں کی مٹھاس بن پاتی
میری صدا کو سماعت کا سہارا دے سکتی

تو میری زبان یوں زہر نہ اگلتی
میرے لیے کسی دیوار پر پرندے نہ ٹھہرتے
جن کے زمزموں سے میرا دل بہلتا
کبھی کسی دیوار پر رقص کرتی چاندنی نہ اترتی
میں اپنے چاروں جانب ایستادہ بلند دیواروں میں قید رہا
میں زمین پر رینگتا، اونگھتا
محرومیوں کی گھٹن لیے ان دبیز دیواروں سے سر ٹکراتا
جن کی بنیادوں میں کئی زمانوں کے خزانے مدفون ہیں
ایسے خزانے جنھیں حاصل کرنے کی خاطر
سایۂ دیوار بھی کھو بیٹھیں

محرومیوں کی گٹھڑی

بیس برس کا تنہا سفر
بیس برس کی محرومیاں
جو بچپن کے برہنہ پیڑ تلے
میرے ساتھ رینگتی رہیں
دوست بن کر کھیلتی رہیں
شام ہوتے لوٹ جاتی تھیں
پیڑ اپنے دامن میں پرندے لپیٹ کے سو جاتا
میں اداسی کی چادر اوڑھے

دن بھر کی تنہائی کندھے پہ اٹھائے
خواہشوں کے جگنو پکڑتے گھر لوٹتا
جہاں خوشیوں کے سورج کا خونیں بدن ڈوب رہا ہوتا
ضرورتیں چمک رہی ہوتیں
بے دیوار آنگن خاموشی سے قدموں کی چاپ سنتا
اور چولھے سے نکلتے ہوئے سست رو دھویں کو دیکھتا
جو ایسے آسمان کی جانب جاتا
جیسے روح بدن کو چھوڑ کر جاتی ہے
سہمے آنگن کے ایک جانب شکستہ کمرے میں بچھا بوسیدہ پلنگ
جس سے چپکی محرومیاں مجھ سے لپٹ جاتیں
نیند کی وادی میں خوابوں کے پھول چنتے صبح ہو جاتی
آنکھ کھلنے پر وہی بوسیدہ کمرہ، سہما ہوا آنگن
چولھے سے نکلتی روح
اور ماں کی آواز ''جلد منہ دھو لے، ناشتہ کر لے''
''محرومیوں کی گٹھڑی اٹھانے جانا ہے''

تندور دہک رہا ہے

تندور دہک رہا ہے
لوگ بھوکے پڑے ہیں
سب کے بدن سوکھے پڑے ہیں
یہ خواہشوں کے مارے معصوم انسان
انسانوں کے جنگل میں، ضرورتوں کے مارے
معاش کے درخت کاٹتے اور ضرورت کی شاخیں جمع کرتے
اور دیکھتے ہیں
کہیں بہار کی رنگینیاں تو کہیں خزاں کے ویرانے
کہیں خوشیوں کے سریلے گیت تو کہیں آرزوؤں کے ماتم
کوئی ٹانگیں پسارے پڑا ہے تو کوئی محوِ سفر ہے
کہیں شکار کی تاک میں جال پھیلائے ہوئے مکڑیاں
پھن پھیلائے ہوئے زہریلے سانپ

دندناتے ہوئے خونیں بھیڑیے
چالاکیوں کے پھندے لگائے لومڑ
چھلانگیں لگاتے ہوئے چیختے بندر
کوئی سوکھی لکڑیاں چن رہا ہے
کوئی ہری شاخیں کاٹ رہا ہے
کوئی تندور کے لیے۔۔۔کوئی پیٹ کے لیے
شام کو تھکے ہارے یہ تہذیب کے پروردگار
یہ ارتقا کے پیشوا، گھروں کو لوٹتے ہیں
دہکتا ہوا تندور انھیں اپنی طرف بلاتا ہے
تندور چی سب کو مسکرا کر دیکھتا ہے
اپنی دھن میں گیت گاتا، روٹیاں لگاتا ہے
دھوئیں سے آلودہ چندھی آنکھوں سے سب کو دیکھتا ہے
انسان بھی کیا ہے۔۔؟
کوئی تندور کی آگ میں جلتا ہے تو کوئی حسد کی
روٹیاں پک رہی ہیں
تندور دہک رہا ہے
لوگ بھوکے پڑے ہیں

کھوکھلی محبت

میں تیری محبت کی عفت کو کیسے مان لوں
جو کئی قسم کی محبتوں کا مرکب ہے
دغا کی عفونت
لالچ کی رنگینیاں
جھوٹ کی نمائش
فریفتگی کے جھانسے
وعدوں کا فریب
اس عارضی رنگین مرکب کو کیا سمجھوں
چند روزہ سکوں۔۔؟
یا غلاظت کے ڈھیر پہ پڑا ہوا گلاب

تم نے تو محبت کو شطرنج کا کھیل سمجھا
جس کے ہر مہرے پر تم نے اپنا حق جتایا
جی چاہتا ہے تمھاری اس فریبی محبت کے
انگ انگ کو نوچ ڈالوں
فقط استخواں تمھارے لیے چھوڑ دوں
مگر ڈر لگتا ہے
تمھارے دغا، فریب، لالچ اور جھوٹ
اس کی ہڈیوں کو بھی کھوکھلا کر دیں گے

ایک کمی

جب کہانی کا مرکزی کردار مر جائے
تو ثانوی کردار ادھورے رہ جاتے ہیں
یہ ادھورا پن بھی کتنی بڑی کمی ہے

مجبور

وقت کے نازک لمحوں میں
ہم دونوں بہت قریب تھے
پر ایک دوجے کے دل سے بہت ہی دور
اس پر بھی بلا کی خاموشی طاری تھی
میں بھی بولنے سے عاری تھا
دونوں اپنی اپنی انا کے ہاتھوں مجبور تھے

کسے معلوم انجامِ محبت

تیرے وعدوں کے خمیدہ رستے پر
میری نڈھال حسرتوں سے اور نہیں چلا جاتا
تم سے جڑی ہر آس بغاوت پر اتر آئی ہے
تمھاری یہ محبت جفاؤں کا آمیختہ ہے
تمھاری تسلیاں اور پیار کے دلاسے سب میرا آموختہ ہے
ہر صبح میری سرخ آنکھیں امیدِ نو کا سورج دیکھتی ہیں
مگر جب شام سرمئی اندھیرا پہن لیتی ہے
انتظار کے چراغوں کا دھواں آنکھوں کی پتلیاں پھیلا دیتا ہے
یہ انتظار کب مجھے نیند کی وادی میں دھکیل دیتا ہے، معلوم نہیں

خوابوں کی تتلیاں بوجھل پلکوں پر آ بیٹھتی ہیں
رات بھر تیرے خوابوں کی ایک مجلس بپا رہتی ہے
سَحر ہونے سے ذرا پہلے ایک ماتمی جلوس برآمد ہوتا ہے
حسرتیں نوحہ کناں ہوتی ہیں
آہیں اور نالے زنجیر زنی کرتے ہیں
محبت اپنے ''ہونے'' اور ''نہ ہونے'' کی مرثیہ خوانی میں مصروف ہے
دل ایک کونے میں پڑا کانپتا ہوا محوِ دعا ہے
منتظر ہے کسی سورج کی حدت بھری کرنوں کا
جو اس کے بدن میں استراحت بھر دیں

پہیہ

چنچل ہواؤں سے باتیں
لہلہاتے کھیتوں کے نظارے
موسم کی حسین ادائیں
معطر خوشگوار فضائیں
گلابوں کی مسکراہٹیں، کلیوں کی اٹھکیلیاں
شاخوں کی عصمت دری پر خشک پتوں کی ماتم
چلچلاتی دھوپ میں سورج کا انتقام
سیاہ بادلوں کے گھنیرے سائے
بارش کی بوندوں سے اٹھنے والی بھینی بھینی مہک
سرکنڈوں سے نکلتے ہوئے جگنوؤں کے قافلے
سرسوں کے پھولوں سے کھیلتی تتلیوں کی ٹولیاں
گھوڑے کی ٹاپوں سے نکلتی تھاپ
جیسے طبلہ نواز کی انگلیوں کا جادو
دھیرے دھیرے پہیے کا گھومنا
وقت کے رباب پر زندگی کا جھومنا
دلکش منظروں سے گزرتے ہوئے

کوچوان کا گنگنانا

''ٹانگے والا خیر منگ دا

ٹانگہ لہور دا ہووے بھانویں جھنگ دا

ٹانگے والا خیر منگ دا''

اب سیاہ شیشوں کے پیچھے بیٹھ کر

چپ چاپ منظروں سے گزر رہے ہیں

سب موسم ایک جیسے، نہ دھوپ نہ جاڑا

نہ بہار کی رنگینیاں نہ تتلیوں کی ٹولیاں

وحشت زدہ سڑک کے کناروں پر دھول کے طوفان

غبار میں اٹے درختوں کی سسکیاں کون سنتا ہے

تارکول سے چمکتی سڑکوں سے باش کی بوندوں کی مہک کب آتی ہے

سائیلنسروں سے نکلتا دھواں خوشبوئیں نگل رہا ہے

کوچوان کا گیت خاموش ہو گیا ہے

ٹاپوں کی صدا، ہارنوں میں بدل گئی ہے

پہیہ گھوم رہا ہے

انسان خود سے بیگانہ پہیے کی مانند بھاگ رہا ہے

بابو☆

بابو! کس دیس چلا گیا تو
تیرے بعد اداس ہے بام کُو
نجانے کن پردوں کے پیچھے جا چھپا
کن ان دیکھی دیواروں کے پار اتر گیا
میری صدائیں ٹکڑا کر واپس پلٹ آتی ہیں
مگر تو نہیں آتا
کبھی دیوار سے جھانک تو سہی
تیرے بنا ہر پل، ہر گھڑی
سرو و سمن اور کلی

☆ **بابو**: معروف استاد اردو ادب، ڈاکٹر تصدیق اقبال جن کا تعلق سوات سے تھا، کتاب کی تزین میں جن کی محبت ساتھ رہی مگر اشاعت سے پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

چاند اور چاندنی سب اداس ہیں
نہ پھول مہکتے ہیں، نہ جگنو چمکتے ہیں
بابو! آواز تو دے
یہ کیسی خاموشی ہے؟
میرے نغمے کو ساز تو دے
جنگل جنگل، صحرا صحرا، نگر نگر
ڈھونڈ چکا ہوں
بابو! کس پار چلا گیا تُو ؟
بابو! یہ دیوار گرا دے
یا خود واپس آ جا
یا مجھ کو پاس بلا لے

بدتر غلام

اے کشمیر و فلسطین۔۔۔!
شہدا کی سرخ زمین
چھپن غلام اذہان نے ایک سوال بھیجا ہے
جس کا جواب تُو
گھبرائی ممٹیوں، آشفتہ بالکنیوں سے پوچھ
خستہ دروازوں، لرزتی دیواروں سے پوچھ
گھائل زینوں، کانپتی کھڑکیوں سے پوچھ
برہنہ لاشوں سے آراستہ سڑکوں سے پوچھ
دھوئیں میں گم ہوتی ننھی روحوں سے پوچھ

ویران بازاروں، مسمار عمارتوں سے پوچھ
زخمی گلیوں، پریشان چوباروں سے پوچھ
بارود کے سیاہ کش لگاتی چمنیوں سے پوچھ
بینائی کو ڈستے اجڑے منظروں سے پوچھ
ٹوٹے کھلونوں، شکستہ چوڑیوں سے پوچھ
سماعت کو نگلتی دریدہ صداؤں سے پوچھ
فگار گنبدوں، خاموش میناروں سے پوچھ
اداس مسکراہٹوں، منتظر نگاہوں سے پوچھ
ہم خود غلام تیری مدد کے لیے کیسے آئیں؟

تمھارے خیر خواہ

بدتر غلام

GARDISH E KHAAK
BY
MANNAN LATEEF

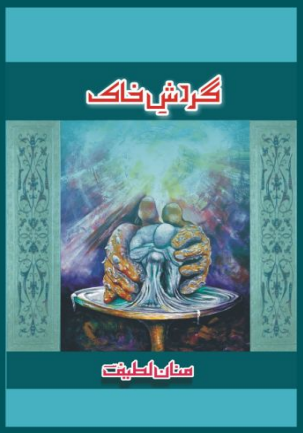

اردو نظم اپنے سفر کے دوران مختلف ہیئتوں کے پیرہن بدلتی رہی۔عربی اور فارسی کے تتبع میں پابند نظم کا رواج عام ہوا۔انگریزی ادب کے زیرِ اثر بیسویں صدی کے وسط میں آزاد نظم نے اردو شاعری میں جگہ بنائی۔آزاد نظم سے آسانی کی طرف آتے ہوئے شعرا نے نثری نظم کو اپنا لیا،جس میں ردیف وقوافی کے ساتھ ساتھ ارکان کی پابندی سے بھی آزاد ہو گئے اور خیال کو پیش کرنے میں مزید آسانی پیدا ہو گئی۔لیکن میرے نزدیک نثری نظم لکھنا زیادہ مشکل ہے۔اس میں نثر کی ترتیب کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے اور لائنوں کی کرافٹ کو بھی۔ ہر لفظ اپنے ہونے کا جواز لے کر آتا ہے۔البتہ علم بیان و بدیع اور صنائع بدائع کو غزل یا آزاد نظم کی نسبت نثری نظم میں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

منان لطیفؔ سے ملاقات تین سال پہلے ہوئی، جب یہ جونؔ کا دیوانہ اور غالبؔ کا پروانہ تھا۔آغاز میں جب اس نے مجھے اپنی چند غزلیں اور نظمیں دکھائی تو ان میں ایک چنگاری نظر آئی جو اب شعلہ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔وہ نہ صرف اردو ادب کا طالب علم ہے بلکہ میرے نزدیک کلاسیکی اور جدید شاعری کو اچھی طرح سمجھتا بھی ہے۔شاید وہ اوزان و بحور کی قید برداشت نہ کر سکا اس لیے غزل سے تائب ہو گیا۔اس کی نثری نظم میں وہ دم خم موجود ہے جو ابتدا میں کسی بڑے شاعر بننے کی پیش گوئی بن سکتا ہے۔اس کے ہاں راشد کی سی تاریخیت کا شعور اور مجید امجد کے جیسی باریک بینی اور جوش کی طرح لفظی مرقع کشی موجود ہے۔وہ نظم کے فن سے آگاہ بھی ہے اور اس کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔''گردشِ چاک'' اس کی ابتدائی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں اس کے ذاتی خواب اور اس کی ذات سے جڑے ہوئے تصورات و محسوسات موجود ہیں۔اس میں فن کی پُرکاری بھی موجود ہے اور موضوعات کی رنگینی بھی۔وہ لفظوں کی حسیات کو بیان کرنے کا سلیقہ بھی رکھتا ہے اور ان کے ابلاغ کا قرینہ بھی۔کہیں کہیں اس کی نظمیں ایک وسیع المطالعہ قاری کی ضرورت محسوس کرتی ہیں مگر ایک عام قاری بھی ان سے معانی اخذ کرنے میں تامل نہیں کر سکتا۔ادب کے اس خارزار میں پہلا قدم رکھنے پر میں کھلے دل سے اس کا استقبال کرتا ہوں اور کتاب کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

عارف حسین عارفؔ